رجسٹرڈ نمبر ا ے ۲۹۰۲

دائرۂ حمیدیہ کی اعانت

دائرۂ حمیدیہ کی خدمت و اعانت کتاب الٰہی کی خدمت و اعانت ہے۔ اس کی تین صورتیں ہیں:

(۱) جو حضرات سو روپے یکمشت دائرہ کو عنایت فرمائیں گے وہ دائرہ کے معاون دائمی تصور ہوں گے۔ ان کو دائرہ کا رسالہ الاصلاح اور تمام مطبوعات ہدیۃً دی جائیں گی۔

(۲) جو حضرات پچاس روپے یکمشت عنایت فرمائیں گے ان کو رسالہ الاصلاح و دائرہ کی دوسری مطبوعات بر نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

۳۔ جو حضرات دس روپے سالانہ عنایت فرمائیں گے ان کی خدمت میں الاصلاح ہدیۃً جاری کیا جائے گا اور سال بھر کی مطبوعات بلا قیمت بھیجی جائیں گی۔

ہدایات و قواعد

۱۔ "الاصلاح" ہر انگریزی مہینہ کی پندرہ تک شائع ہوگا۔

۲۔ اگر مہینہ کے آخر تک پرچہ نہ پہنچے تو فوراً دفتر کو لکھ کر منگوا لیجئے ورنہ بقیمت بھیجا جائے گا۔

۳۔ مضامین وغیرہ اڈیٹر کے نام بھیجئے اور دفتر سے متعلق امور کیلئے تمام خط و کتابت منیجر سے کیجئے۔

۴۔ دفتر سے خط و کتابت کرنے میں خریداروں کو نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے۔

۵۔ چندہ سالانہ چار روپے۔ بیرون ہند کے لئے چھ روپے۔ فی پرچہ چھ آنے۔

عبدالاحد اصلاحی — منیجر دائرہ حمیدیہ — سرائے میر اعظم گڑھ

عبدالاحد اصلاحی نے اصلاحی پریس سرائے میر اعظم گڑھ میں چھپوا کر شائع کیا۔

الاصلاح

دائرۂ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

دائرۂ حمیدیہ کی اردو مطبوعات

تفسیر سورۂ اخلاص

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر اردو میں لکھی ہے۔ اس سورہ کی ہر دور میں بیشمار تفسیریں لکھی گئیں، لیکن اہل نظر نے اعتراف کیا ہے کہ علامہ فراہی کی تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں، ان سے تمام تفسیریں خالی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین، کاغذ نہایت عمدہ۔ قیمت ۵ر

تفسیر سورۂ والتین

استاذ امام علامہ فراہی رحمہ اللہ کی تفسیر سورۂ والتین کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں تین، زیتون، طور سینین اور بلد امین سے وجوہ استشہاد اور ان کی تحقیق کے متعلق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ تحقیق اور وسعت نظر کا اعجاز ہے۔ قیمت ۴ر

تفسیر سورۂ کوثر

استاذ امام مولانا فراہی رحمہ اللہ کی تفسیر سورۂ کوثر کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں کوثر کی تحقیق، خانہ کعبہ کی روحانی حقیقت اور نماز و قربانی کے اسرار و حقائق پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کی بھی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت و طباعت جاذب نظر۔ تقطیع ۲۰×۲۲، ۱۲۳ صفحے۔ قیمت ۸ر

| جلد ۴ | ماہ شعبان المعظم ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۳۹ء | نمبر ۱۰ |

فہرست مضامین

عنوان	مصنف	صفحہ
شذرات	امین احسن اصلاحی	۲ - ۹
معارف قرآن		
تفسیر سورۂ ذاریات	استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ	۹ - ۲۱
اقسام القرآن	" " "	۲۲ - ۳۱
مقالات		
فلسفۂ اجتماع	جناب مولانا عبد الرشید نواب رشد کی خطیب جامع مسجد سورتی رنگون	۳۲ - ۴۲
مذاکرہ		
ہمارے علماء کے فقہی اختلافات	امین احسن اصلاحی	۴۳ - ۵۳
افکار جدیدہ		
بدن کا شیطان	جناب مولوی عزیز الرحمٰن صاحب اصلاحی	۵۴ - ۵۶
عورت اور اخلاق	" " "	۵۶ - ۵۸
بخل و حرص	" " "	۵۸ - ۶۰
مایوسوں کا سہارا	" " "	۶۱ - ۶۴
تقریظ و تبصرہ	" " "	۶۴ - ۷۳

شذرات

گھر میں کوئی مانوس بلی اور پلی ہوئی چڑیا ہو تو بچے ان کے چونچلوں اور پیار و محبت کی اداؤں سے اسقدر مانوس ہو جاتے ہیں کہ ان کو گمان بھی نہیں گذرتا کہ ان کی فطرت میں انس و محبت کے سوا کوئی اور صفت بھی ہے۔ معصوم چڑیا اڑ کر کاندھے پر بیٹھ جاتی ہے اور مسکین بلی دوڑ کے گود میں آتی اور کھیلنے لگ جاتی ہے۔ بچے سمجھتے ہیں کہ ان کی فطرت یہی ہے اور اس غلط فہمی کی وجہ سے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ بلی کی دم اور اس کے کان پکڑ کر کھینچنے لگ جاتے ہیں اور چڑیا کی چونچ میں انگلیاں ڈال دیتے ہیں، اس وقت ان کو دفعۃً نظر آتا ہے کہ جس بلی کے پاس انس و محبت کے چونچلے ہیں اس کے پاس تیز ناخون اور خوفناک پنجے بھی ہیں اور جس مشت بال و پر کے پاس شیریں نغمے اور پر نشاط چہچے ہیں اس کے پاس خوفناک چنگل اور زخم لگانیوالی چونچ بھی ہے اور کبھی کبھی ان کے یہ مخفی اسلحہ بھی بے نیام ہو جایا کرتے ہیں۔ یہ حالت اپنے گھروں کے اندر ہم روز دیکھتے ہیں لیکن ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتے حالانکہ زندگی کے بڑے بڑے واقعات کی طرح ان چھوٹے چھوٹے سوانح و حالات کے اندر بھی ہمارے لئے عبرت و بصیرت کے نہایت قیمتی سبق محفوظ ہیں وکاین من اٰیۃ فی السمٰوات والارض یمرون علیہا وھم عنہا معرضون۔

گھروں کے اندر کی یہی حالت باہر کی دنیا میں بھی موجود ہے اور بچوں کی یہی بھولی بھالی

طبیعت حیوانوں کے اندر بھی اپنا ظہور رکھتی ہے اور اس سے کسی کے اس مقولہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ "انسان ماں کی گود سے لیکر قبر کی آغوش تک یکساں ہے"۔ کٹہرے کا شیر جب مانوس ہو جاتا ہے تو اس کا نگراں اس کو تھپکیاں دینے لگتا ہے اور سمجھتا ہے اب شیر نے لومڑی کی فطرت اختیار کرلی ہے لیکن جب کسی دن اس کو پھاڑ کھاتا ہے تو کھلتا ہے کہ شیر کبھی لومڑی نہیں بن سکتا البتہ آدمی کبھی کبھی گدھا بنجایا کرتا ہے۔ ولقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددنٰہ اسفل سافلین

بعض اوقات .... یہی بودا پن قوموں اور جماعتوں کے اندر نمایاں ہو جاتا ہے۔ وہ کھاتی ہیں، پیتی ہیں، عیش کرتی ہیں، پھر شرارتیں کرنے لگتی ہیں، یہاں تک کہ خدا کی زمین کو ایک فرمانبردار ناقہ اور ایک مطیع مرکب سمجھکر اس کی پیٹھ پر کودنے اور اچھلنے لگ جاتی ہیں۔ اسوقت دفعۃً ایسا ہوتا ہے کہ یہ زمین ایک خوفناک اژدہے کی طرح کروٹ بدلتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمین کی فطرت میں صرف اطاعت ہی نہیں بلکہ غضب کا جوش اور غصہ کا ہیجان بھی ہے لیکن یہ جوش و غضب کبھی کبھی ابلتا ہے، جب انسان اسکے کاندھوں پر کھیلتے کھیلتے شرارت کرنے لگ جاتا ہے فتلک بیوتھم خاویۃ بما ظلموا ان فی ذلک لاٰیۃ لقوم یعلمون۔

ایسے ہی سرکش انسان ہیں جنکو سورہ انفطار میں مخاطب کرکے قرآن نے پوچھا ہے کہ ما غرک بربک الکریم۔ تم کو تمھارے فیاض و مہربان پروردگار کے بارہ میں کس چیز نے دھوکے میں ڈالدیا۔ کیا تم اس کی فیاضی کی کرم گستریوں اور جود و عطا کی دریا نوازیوں سے اسقدر ڈھیٹ ہو گئے کہ اس کے عدل کے قانون کو بھول گئے اور یہ بات تمہیں یاد نہیں رہی کہ اگر ایک ہاتھ سے وہ مہر نوازش کے خوان کرم بچھاتا ہے تو دوسرے ہاتھ کے کوڑے سے سرکشوں

اور نافرمانوں کی عدالت بھی کرتا ہے؟ عربی کے طلبہ اس آیت کا اسلوب فرمائیں کے معرض ماغو ربہ با کلامہ اور اصل سے سمجھ سکتے ہیں لیکن قرآن نے "رب کریم" کہکر اسکی بلاغت کو ایسی بلندی پر پہنچا دیا ہے کہ اس کی شرح کے لئے مستقل فرصت مطلوب ہے۔

یہود نے خدا کی مہر و نوازش کو دیکھا کہ وہ مسلسل ہے، وہ فرعون کے پنجے سے نجات دیتا ہے، سمندر کی موجوں کے اندر ان کیلئے راہ صاف کرتا ہے، سینا کے میدانوں میں ابر کا سایہ اور روشنی کا ستون نگران کے ساتھ چلتا ہے، وادی مقدس بقعۂ مبارکہ کے اندر ان سے ہمکلام ہوتا ہے، آسمان سے ان کیلئے من و سلوی اتارتا ہے، اور مقدس کے اندر ان کیلئے داؤد و سلیمان کا تخت بچھاتا ہے۔ انھوں نے یہ سب کچھ دیکھا اور یہی دیکھتے دیکھتے انکی کئی پشتیں گذر گئیں نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بالکل بھول گئے کہ خدا کے پاس کوئی قانون عدل و راسکے ہاتھوں میں انصاف کا کوئی ترازو بھی ہے بل ... نحن ابناء الله واحباؤه۔ آہستہ آہستہ انھوں نے یہ خیال کر لیا کہ جو کچھ انکو ملا ہے وہ محض اسرائیل کے گھرانے کے ہونے کی بنا پر ملا ہے، اسکے ساتھ کسی عہد کی پابندی اور کسی عمل کی ذمہ داری ان کے سر نہیں ہے۔ جو ان میں سے ہے وہ خدا کا محبوب ہے اور ہمیشہ اسکا محبوب رہیگا اور جو ان سے باہر ہے وہ خدا کا معتوب ہے اور عمل و اعتقاد کی کوئی خوبی اسکے کام نہیں آسکتی جب وہ اس حالت کو پہنچ گئے اور اپنے پروردگار سے انس کرتے کرتے جری اور شریر ہو گئے یہانتک کہ اسکو بالکل بھول بیٹھے تو خدا کا عدل نمودار ہوا جسکا ذکر سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: فاذا جاء وعد اولٰهما بعثنا عليكم عبادا لنا اولي باس شديد فجاسوا خلال الديار وكان وعدا مفعولا (بنی اسرائیل)۔ وليدخلوا المسجد كما دخلوه اول مرة وليتبروا ما علوا تتبيرا (بنی اسرائیل)۔ اور یہ کوڑا آجتک بنی اسرائیل کی پشت سے الگ نہیں ہوا کل بخت نصر اور ٹیٹس کے ہاتھ میں تھا، آج ہٹلر اور مسولینی کے ہاتھ میں ہے اور اس بیچ کی تاریخ پر بھی جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ تازیانہ یہود کے ساتھ سایہ کی طرح ہے اور قیامت تک رہیگا۔ وضربت عليهم الذلة الآية

نصاریٰ نے خدا کی عدالت کا انکار ایک دوسری راہ سے کیا، نسل کا غرور اور نعمت کی غفلت سے خدا نے انکو محفوظ رکھا لیکن غضب کے دروازے بند ہوئے تو شیطان نے دوسرے چار دروازے کھول دیئے۔ اپنے پہلے کے مشرکوں کی

تقلید میں جہاں انھوں نے اپنے پاک دین میں بہت سی آمیزشیں کیں وہاں انسانی فطرت کی، نئی بدبختی اور کفارہ کے عقیدہ سے خدا کے عدل کو بھی باطل کر دیا اور دین کا یہی نقطہ ہے جس پر شیطان سب سے پہلے اپنی فوجوں کے ذریعہ حملہ کرتا ہے۔ اس عقیدہ نے حسن عمل کی تمام سرگرمیوں کو معطل کر کے ساری سعادت و کامیابی مسیح کی الوہیت اور انکی سولی کے عقیدہ کے ساتھ وابستہ کر دی اور عیسائیوں میں عام طور پر یہ خیال پھیل گیا کہ خدا کی دنیا عدل پر نہیں قائم ہے رحم پر قائم ہے، شیکسپیر نے بھی اپنے مشہور ڈراما Merchant of Venice میں عدل کی جگہ رحم ہی کا تصور پیش کیا ہے اور گو غایت درجہ موثر اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے لیکن یہ تصور صحیح ہونے کے ساتھ ساتھ اسقدر غلط ہے کہ اسکو بے تکلف آسمان کے نیچے کی چند سب سے زیادہ سنگین غلطیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

دنیا میں یہی گمراہیاں پھیلی ہوئی تھیں کہ قرآن نازل ہوا اور اس نے یہود، نصاریٰ، مشرکین سب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

اللہ، فرشتے اور اہل علم گواہ ہیں کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ، قسط پر قائم۔ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی، عزیز اور حکیم۔

اس آیت میں "قائما بالقسط" کا لفظ، اسکا محل، اللہ، ملائکہ اور اہل علم کا اس شہادت پر اجماع اور پھر عزیز و حکیم کی صفت یہ ساری چیزیں قابل تشریح ہیں اور سب سے بڑھکر سورہ میں اس آیت کا محل قابل غور ہے لیکن یہاں ان دقیق مباحث میں پڑنے کا موقع نہیں ہے، البتہ اتنی بات یاد رکھنی چاہئے کہ قرآن نے خدا کی عدالت کو اس کثرت و تکرار اور اتنی گوناگوں قسموں اور شکلوں میں بیان کیا ہے کہ اس کے بعد توضیح و تشریح اور تعریفات کے کسی اور درجہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

یہی حقیقت ہے جس کو یہ چھوٹی سی آیت ظاہر کرتی ہے۔

يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۔ آل عمران — اور اللہ تم کو اپنی ذات سے ہوشیار کرتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تو رحیم ہے، ودود ہے، شکور ہے، حلیم و غفار و ستار ہے، وَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى، وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى، اس کے لئے ساری اچھی صفتیں اور تمام پاکیزہ مدحتیں ہیں، پھر وہ اپنی ذات سے ایک خطرہ کی طرح ہوشیار کیوں کرتا ہے۔ اور ایک خوفناک

چیز کی طرف ڈرتا کیوں ہے؟ جس کی طرف سے صرف رحمتیں ہی رحمتیں ہوں اور جس کا لطف وکرم ایک پل کے لئے بھی انسان کو فراموش نہ کرتا ہو اس سے انسان انس کیوں نہ پکڑے؟ بھاگے اور گھبرائے کیوں؟ کیا اس کی نوازشوں کے اندر قہر کا بھی کوئی پہلو ہے؟ اور اس کی دلنوازیوں کے اندر خشم وعتاب کا بھی کوئی انداز ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہاں! خدا عادل ہے، وہ قسط پر قائم ہے۔ اور اس قسط وعدل سے وہ کبھی نہیں ہٹے گا۔ پس کسی کے لئے بھی جائز نہیں کہ وہ اس کی مہربانیوں کے تسلسل اور اس کی نوازشوں کی بے پایانی سے شوخ اور دلیر ہو کر ایمان وعمل کے اس قانون کو توڑ دے جو اس نے خلق کی سعادت اور آسمان وزمین کے قیام کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ جو لوگ اس بات کو بھول جائینگے اور مدت نعمت کی درازی اور عہد تنعم وتعیش کے امتداد سے مدہوش ہو کر اس کے سامنے دلیر اور شوخ ہو جائینگے۔ ان کیلئے خدا کی مہربان ذات سے بڑھکر کوئی چیز بھی خوفناک نہیں ہے۔ اسلئے اگر وہ ایک طرف مہر ومحبت کی اپنی طرف بلاتا ہے تو دوسری طرف اپنی ذات سے ڈراتا بھی ہے کہ انسان یاد رکھے کہ خدا کی ستودہ صفات میں سب سے زیادہ نمایاں اور ابھری ہوئی صفت عدل ہے جسکی شہادت آسمان وزمین اور ملکوت ولاہوت سب دیتے ہیں۔

اس نے اپنی کتاب میں سلیمان، داؤد، اور ذوالقرنین کو مثال میں پیش کیا ہے کہ جن پر اس کے انعامات کی بارش ہو وہ انہی کی طرح خدا کے شکرگذار اور تابعدار بندے ہیں۔

ذوالقرنین نے جب اپنی زندگی کا سب سے بڑا دفاعی اور جنگی کارنامہ انجام دیا تو کہا هذا رحمة من ربي فاذا جاء وعد ربي جعله دكاء وكان وعد ربي حقا ۔ (الکہف) یہ جو کچھ ہوا میرے پروردگار کی مہربانی سے ہوا اور جب میرے پروردگار کا وعدہ پورا ہوگا وہ اس کو پاش پاش کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ پورا ہو کے رہے گا۔

حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے واقعات سورہ نمل اور سورہ ص اور بعض دوسری سورتوں

میں موجود ہیں، انکو پڑھو وہ اپنی تمام علمی، مالی، فوجی اور تمدنی عظمتوں کو صرف خدا کا فضل قرار دیتے ہیں واوتينا من كل شيء ان هذا لهو الفضل المبين (اور ہم کو ہر طرح کی عظمتیں ملی ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر کھلا ہوا فضل وکرم ہے) اور جب کسی بڑی قابلیت کا ظہور ہوتا ہے خدا کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خداوندا تو ہی باگ تھامنے والا ہے ایسا نہ ہو کہ ان نعمتوں کی فراوانی اور ان عظمتوں کی تابانی راہ سے بے راہ کر دے اور تیرے انصاف سے بے خوف ہو کر ہم دوسری راہوں میں پڑ جائیں رب اوزعني ان اشكر نعمتك التي انعمت علي وعلى والدي وان اعمل صالحا ترضاه وادخلني برحمتك في عبادك الصالحين

اور انہی کے مقابل میں فرعون، ہامان، قارون کا ذکر کیا ہے جو علو وفساد کے نمونے ہیں۔ جو خدا کی نعمتوں کو پا کر اس کے سامنے مغرور ہو گئے اور جنہوں نے دولت کے گھمنڈ اور طاقت کے غرور میں خدا کی باتوں کو حقیر جانا۔ قرآن نے ان کی ذلت وخواری کا ذکر کیا ہے اور ان کی داستانوں کو سنایا ہے کہ ہر عہد کے فراعنہ اور ہر زمانہ کے قارونوں اور ہامانوں کے لئے اس کی عدالت ظہور میں آگئی اور جو لوگ نعمتوں کے ہجوم اور طاقتوں کے حصار میں ہو کر خدا کے عدل کو بھول بیٹھے ہیں وہ اس کی عدالت کا یوم الحساب ضرور دیکھیں گے۔ ولنذيقنهم من العذاب الادنى دون العذاب الاكبر۔

پس آج اسی قانون کا ظہور ہے جو ہم زمین کے چپہ چپہ پر دیکھ رہے ہیں۔ اصنام اصنام سے ٹکرا گئے ہیں، تمدن تمدن سے ٹکرا گیا ہے، اور سائنس نے سائنس کو چیلنج دیا ہے۔ تہذیب

بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون (۴۱ روم) تاکہ ان کے کارناموں کا کچھ مزہ خدا ان کو چکھا دے تاکہ وہ اپنی بے راہ روی سے باز آئیں۔ یہاں بعض الذی عملوا کی بلاغت اور اسکی صداقت قابل غور ہے۔ عمل کے بدلے میں عمل کی حقیقت تو جب سامنے آئیگی آئیگی لیکن خود عمل اپنی تمام ہولناکیوں اور خوفناکیوں کے ساتھ کس طرح سامنے آگیا ہے!۔ خود اپنی سائنس خود اپنے فلسفہ اور خود اپنے کارخانوں نے کس طرح اپنے ہی اوپر یلغار کردی ہے۔ اور خود اپنی ہی ایجادوں سے کس طرح روحیں ہلاک، جسم پامال، کان بہرے اور آنکھیں اندھی ہورہی ہیں۔ یہ خدا کی عدالت ہے جو جنیوا اور ہیگ کی عدالتوں سے بڑی ہے اور اب ظہور میں آئی ہے تاکہ نئے نقشے بنائے، نئی سرحدیں قائم کرے اور ایک نئی دنیا اور نیا تمدن ظہور میں لائے۔

تبدیل اقوام و امم کا یہی وہ موسم بہار ہے جس میں ایک اور سنت اللہ بھی پوری ہوتی ہے۔ جس کا ذکر سورہ قصص میں فرمایا۔

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ

فرعون نے زمین میں سر اٹھایا اور اس کے باشندوں کو گروہ گروہ کردیا ان میں سے ایک جماعت کو کمزور جانتا تھا ان کے بیٹوں کو قتل کرتا تھا۔ اور انکی عورتوں کو زندہ چھوڑتا تھا بیشک وہ زمین میں فساد پھیلانے والوں میں تھا اور ہمارا ارادہ یہ تھا کہ ہم احسان کریں ان لوگوں پر جو کمزور سمجھے گئے اور ان کو امام بنائیں اور انکو زمین کا وارث قرار دیں اور انکو ملک کی سطوت بخشیں اور فرعون و ہامان اور انکی فوجوں کو ان کے [illegible]

اے کاش اس سرزمین پر آج کوئی ایسی جماعت وجود میں آئے جو قرآن کے علم و عمل کیلئے اٹھ کھڑی ہو کہ اللہ کی تائید اس ذرہ سے آفتاب کا کام لے۔

معارف قرآن

تفسیر سورۂ ذاریات

۵

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ (۲۴) إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا ۖ قَالَ سَلَامٌ قَوْمٌ مُنْكَرُونَ (۲۵) فَرَاغَ إِلَىٰ أَهْلِهِ فَجَاءَ بِعِجْلٍ سَمِينٍ (۲۶) فَقَرَّبَهُ إِلَيْهِمْ قَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ (۲۷) فَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ۖ قَالُوا لَا تَخَفْ ۖ وَبَشَّرُوهُ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ (۲۸) فَأَقْبَلَتِ امْرَأَتُهُ فِي صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ عَقِيمٌ (۲۹) قَالُوا كَذَٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ ۖ إِنَّهُ هُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ (۳۰) قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ (۳۱) قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ مُجْرِمِينَ (۳۲) لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِنْ طِينٍ (۳۳) مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِينَ (۳۴) فَأَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (۳۵) فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ (۳۶) وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ (۳۷)

کیا تم نے ابراہیم کے محترم مہمانوں کا واقعہ سنا (۲۴) جبکہ وہ اس کے پاس آئے اور اس کو سلام کیا اور ابراہیم نے بھی کہا سلام (اور جی میں کہا) اجنبی لوگ ہیں (۲۵) پھر (انکو بچا کے) اپنے گھر میں گیا اور لایا فربہ بچھڑا بھنا ہوا (۲۶) اور اس کو ان کے سامنے پیش کیا اور کہا آپ لوگ کھاتے نہیں! (۲۷) پس ان سے دل میں خوف زدہ ہوا انھوں نے کہا مت ڈرو اور اس کو ایک فرزند کی بشارت دی جو صاحب علم ہوگا (۲۸) پس اس کی بیوی حیرت میں آئی اور ماتھے پر ہاتھ مار کے بولی میں تو بڑھیا بانجھ ہوں (۲۹) فرشتوں نے کہا، ایسا ہی فرمایا ہے تیرے رب نے. وہ حکمت والا اور علم والا ہے (۳۰) ابراہیم نے پوچھا اے فرستادو تمھارے سامنے کیا مہم ہے؟ (۳۱) بولے ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں (۳۲) تاکہ ان کے اوپر سنگ گل برسائیں (۳۳) جو معلّمہ ہیں تیرے رب کے ہاں حد سے بڑھنے والوں کے لئے (۳۴) پس ہم نے الگ کیا ان کو جو اس بستی میں اہل ایمان تھے (۳۵) سو ہم نے ایک گھر کے سوا اس میں کوئی فرمانبردار نہیں پایا (۳۶) اور اس بستی میں ہم نے نشانی چھوڑی ان لوگوں کے لئے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں (۳۷)

الفاظ کی تحقیق و جملوں کی تاویل

(از آیت ۲۴ - تا ۳۷)

یہ واقعہ سورہ ہود میں گذر چکا ہے، اور وہاں اسکی ضروری تشریح بھی ہو چکی ہے، یہاں صرف بعض مناسب مقام باتوں کی طرف اشارہ کرنا ہے،

المکرمین اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خندہ پیشانی اور کشادہ دلی کے ساتھ مہمان کا خیر مقدم میزبان کا سب سے پہلا فرض ہے، نیز یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہایت فیاض اور کریم النفس تھے۔

قوم منکرون یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے جی میں فرمائی ہے اور اس کے کہنے کی وجہ یہ ہوئی کہ فرشتے صلحا کے بھیس میں تھے اور صلحا اس زمانہ میں اول تو بہت کم تھے اور جو تھے وہ زیادہ تر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصحاب و متعلقین میں سے تھے۔

فراغ الی اھلہ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حسن خلق اور ان کی کریم النفسی معلوم ہوتی ہے، فیاض اور بلند طبیعت لوگ ضیافت کا اہتمام مہمان کی نظر سے بچا کے کرتے ہیں تاکہ اس پر گراں نہ گذرے، امتنان سے بچنے اور انفاق میں اخفا کی جو تاکید ہے یہ اخلاق اس کا مظہر ہے۔

الا تاکلون جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کھانا پیش کیا لیکن مہمانوں نے انکی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تو نہایت محبت و تواضع کے ساتھ انھوں نے ان سے کھانے کی درخواست کی ہے

فاوجس منھم خیفۃ اوجس یعنی احس فی نفسہ اپنے دل میں محسوس کیا اس کا استعمال زیادہ تر خوف کے لئے ہے، خیفۃ یعنی کسی قدر خوف۔ خوف کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ کھانے سے برابر انکار کرتے رہے جس کے باعث حضرت ابراہیم ؑ کے دل میں ان کی عظمت اور اجنبیت کا احساس بڑھ کر ہو گیا، سورہ ہود میں ہے:

فَلَمَّا رَاٰۤ اَیۡدِیَهُمۡ لَا تَصِلُ اِلَیۡهِ نَكِرَهُمۡ وَاَوۡجَسَ مِنۡهُمۡ خِیۡفَةً ......

پس جب اس نے دیکھا ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھتے، اس نے ان کو اجنبی محسوس کیا اور ان سے دل میں کسی قدر خائف ہوا،

بشروہ یعنی بلند آواز سے بشارت دی یہاں تک کہ حضرت سارہؑ نے جو قریب ہی تھیں، اس کو سن لیا، سورہ ہود میں ہے۔

وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ — اور انکی بیوی کھڑی تھی، پس ہنسی، اور ہم نے اسکو

فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ — خوشخبری دی اسحاق کی،

اور چونکہ حضرت سارہؑ کو یہ بشارت بالواسطہ دی گئی، فرشتوں نے پہلے ان سے براہ راست گفتگو نہیں کی، اس لئے اس آیت میں بشارت کو ملئکہ کی طرف منسوب نہیں فرمایا، بلکہ فرمایا ہم نے اس کو بشارت دی۔

علیم اس سے معلوم ہوا کہ مجرد بیٹے کی بشارت کوئی بشارت نہیں ہے، جب تک کہ اسکے اچھی صفتوں سے متصف ہونے کی بشارت نہ دیجائے، اور یہاں صرف صفت علم کے ذکر پر اسلئے اکتفا فرمایا کہ علم تمام صفات خیر و صلاح کا سرچشمہ ہے۔

فاقبلت یعنی بشارت سننے کے بعد حضرت سارہؑ متوجہ ہوئیں اور اس سے ان کو جو تعجب لاحق ہوا اس کو ظاہر کرنا چاہا جیسا کہ بعد کی آیت سے واضح ہوتا ہے۔

فی صرۃ عربی میں محاورہ ہے صر الفرس اذنیہ، گھوڑے نے اپنے دونوں کان کھڑے کئے، یعنی حضرت سارہؑ نے جب یہ عجیب و غریب بات سنی تو وہ حیرت اور اچنبھے میں پڑگئیں۔

فصکت وجھھا عورتوں کا قاعدہ ہے کہ کوئی اچنبھے کی بات سنتی ہیں تو ماتھے پر ہاتھ مارتی ہیں، یہی حالت حضرت سارہؑ کو پیش آئی اور قرآن نے انکی تصویر کھینچی ہے۔ سورہ ہود میں ہے۔

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا — بولی، ہائے میری کمبختی، کیا میں جنوں گی، حالانکہ میں بڑھیا

عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ؕ اِنَّ — ہو چکی ہوں اور یہ میرا شوہر بھی بوڑھا ہو چکا ہے

هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ — یہ تو بڑے اچنبھے کی بات ہے۔

حجارۃ من طین یعنی کنکریاں، اس کے لئے دوسرا نام سجیل ہے جو سنگ گل سے معرب ہے، سورہ ہود میں اسی واقعہ کے ذیل میں فرمایا ہے، وامطرنا علیھا حجارۃ من سجیل، یہاں سجیل کی تفسیر فرمادی فالقرآن یفسر بعضہ بعضا۔

مسومۃ یا تو "حجارہ" کی صفت ہے یا اس سے حال واقع ہے۔ رہی اس کی لغوی تحقیق تو اخفش نے "تسومین" کی تاویل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسومین یعنی نشان لگائے ہوئے اور چھوڑے ہوئے کے معنی بھی ہو سکتے ہیں جیسا کہ محاورہ ہے "سوم فیھا الخیل اس میں گھوڑوں کو چھوڑ دیا"۔ ابو زید کہتے ہیں کہ "الخیل المسومۃ۔ وہ گھوڑے جنکو اس حالت میں چھوڑا جائے کہ سوار ان کی پیٹھوں پر موجود ہوں، جیسا کہ محاورہ ہے، "سوم فلانا" خلاہ وسومہ لما یرید"۔ پس اگر علامت کے معنی لئے جائیں تو مسومۃ کے معنی معین اور مقدر کے ہوں گے، گویا ہر پتھر پر خدا کی طرف سے تحریر کندہ ہے کہ یہ پتھر فلاں کو لگے گا، اور اگر چھوڑنے کے معنی میں لیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ یہ پتھر خدا کے پاس حد سے تجاوز کرنے والوں کے لئے تیار ہیں۔ سورہ ہود کی آیت اس مفہوم سے بہت قریب ہے۔ من سجیل منضود۔ مسومۃ عند ربک وما ھی من الظلمین ببعید لیکن دونوں تاویلوں کا مآل ایک ہی ہے۔

للمسرفین اسراف کے معنی حد سے بڑھ جانے کے ہیں، یہ لفظ چھوٹے اور بڑے ہر قسم کے گناہ کے لئے عام ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِىَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا — کہو، اے میرے وہ بندو جنھوں نے اپنے نفس

عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا — پر زیادتی کی ہے۔ اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو، اللہ تمام گناہوں کو بخشتا ہے۔

لیکن قرینہ عام کو تعین کر دیتا ہے۔ پس یہاں اس سے بطریق کنایہ وہ معصیت مراد ہوگی جس میں لوطؑ کی قوم مبتلا تھی۔

فاخرجنا ــــ الیم یہ فرشتوں کا قول نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ قوم لوطؑ کے ساتھ معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا۔ اس کی خبر دی گئی ہے، کیونکہ یہ معلوم ہے کہ فرشتوں نے حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کو بستی سے اس وقت نکالا ہے جب حضرت ابراہیمؑ کے پاس سے رخصت ہو چکے ہیں، ہمارے اس خیال کی تائید لفظ "فیہا" سے بھی ہوتی ہے جس کی تشریح آگے آتی ہے۔

فیہا یہاں ضمیر کا مرجع یعنی ارض لوط اور معذب بستی مذکور نہیں ہے "ارض ان اسماء" میں سے ہے جن کے لئے ضمیر محض قرینہ کی وجہ سے بھی آجاتی ہے، ان کا مذکور ہونا کوئی ضروری شرط نہیں ہے، یہاں قرینہ نہایت واضح موجود تھا۔ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ یہ قول اللہ تعالیٰ کا ہے۔ پس لازماً یہ وفی الارض اٰیات للموقنین والی آیت سے متصل ہوگا۔ یہ بیچ کا قصہ زمین کی انہی نشانیوں کے بیان کے لئے آیا ہے جنکا اوپر کی آیت میں حوالہ دیا گیا ہے، اور یہ بات گذر چکی ہے کہ عرب ان بستیوں کے آثار و حالات سے باخبر تھے، یہاں بعد کی آیت اسی حقیقت کی تصریح کر رہی ہے۔ وترکنا فیہا اٰیة للذین یخافون العذاب الالیم یعنی یہ جزا پر گواہ ہیں۔

من المسلمین لوط کی بستی میں مسلم خاندان صرف لوطؑ کا خاندان تھا، اس خاندان کے

مومنوں کو اللہ تعالیٰ نے نجات دی لیکن لوطؑ کی بیوی مومنہ نہیں تھی، وہ اس مقدس خانوادہ میں محض ظاہر دارانہ شریک تھی، اسی لئے خاندان کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے مسلمین کا لفظ اختیار کیا۔

۱۲- اس واقعہ کا تعلق سابق و لاحق سے

اوپر کی آیات میں یہ بیان فرمایا ہے کہ زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں (۲۰ - ۲۳) اور یہ امر معلوم ہے کہ زمین میں رحمت اور عذاب دونوں کی نشانیاں ہیں۔ رحمت کا ثبوت وہ پھیلا ہوا خوان کرم ہے جو ہر جاندار کے لئے یکساں فیاض ہے، اور عذاب کی شہادت معذب قوموں کے وہ آثار ہیں جو اب تک باقی ہیں۔ نیز اوپر بیان فرمایا تھا کہ "آسمان میں تمہارے لئے روزی اور عذاب دونوں ہے"۔ پس حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے ان قصص میں بشارت اور رحمت اور عذاب اور انذار کو بالکل ممثل کرکے نگاہوں کے سامنے پیش کر دیا۔ اس لحاظ کر یہ واقعات اصلاً "وفی الارض اٰیٰت" اور "وفی السماء رزقکم" سے مربوط ہیں، اور ہمارے اس خیال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اس مجموعہ کے خاتمہ کی آیت یہ ہے۔

وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ — اور اس میں ہم نے نشانی چھوڑی ہے ان لوگوں کیلئے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں۔

اس میں "فیہا" کا لفظ جیسا کہ ہم نے سابق فصل میں اشارہ کیا ہے خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ نیز اس واقعہ کے ساتھ جو دوسرے قصے جوڑے گئے ہیں ان کے جوڑنے کے لئے عطف کا اسلوب اختیار فرمایا ہے۔ مثلاً فرمایا وفی موسیٰ الآیہ۔ اس معلوم ہوا

کہ مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مہمانوں کے واقعہ میں اور قوم لوط کے عذاب میں مخاطب کے لئے کافی عبرت و موعظت کا سامان ہے۔

علاوہ ازیں سورت کے شروع میں جو بات فرمائی گئی ہے اس قصہ میں اس کو بھی مثل کیا گیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل آگے آئے گی اور یہی صورت بعد کے تمام امثال و قصص کی ہے، چنانچہ فرمایا۔

وَفِي مُوسَىٰ إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ (٣٨) فَتَوَلَّىٰ بِرُكْنِهِ وَقَالَ
سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ (٣٩) فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيمٌ (٤٠)
وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ (٤١) مَا تَذَرُ مِن شَيْءٍ أَتَتْ عَلَيْهِ
إِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيمِ (٤٢) وَفِي ثَمُودَ إِذْ قِيلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوا حَتَّىٰ حِينٍ (٤٣) فَعَتَوْا
عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ وَهُمْ يَنظُرُونَ (٤٤) فَمَا اسْتَطَاعُوا
مِن قِيَامٍ وَمَا كَانُوا مُنتَصِرِينَ (٤٥) وَقَوْمَ نُوحٍ مِّن قَبْلُ إِنَّهُمْ كَانُوا
قَوْمًا فَاسِقِينَ (٤٦)

اور موسیٰ کے قصہ میں بھی نشانی ہے جبکہ ہم نے اس کو بھیجا فرعون کے پاس نہایت کھلے غلبہ کے ساتھ (٣٨) سو اس نے اعراض کیا اور بولا یا تو یہ جادوگر ہے یا مجنون (٣٩) پس ہم نے اس کو اور اس کی فوج کو پکڑا اور ان کو دریا میں پھینک دیا اور وہ سزاوار ملامت تھا (٤٠) اور عاد کے واقعہ میں بھی نشانی ہے جبکہ ہم نے بھیجی ان پر نامبارک آندھی (٤١) نہیں وہ گزرتی تھی کسی شے پر مگر اس کو کر ڈالتی تھی ریزہ ریزہ (٤٢) اور ثمود کے واقعہ میں بھی نشانی ہے جبکہ ان سے کہا گیا چند دن اور کھا لیں لو (٤٣) تو انہوں نے اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی پس ان کو پکڑا کڑک نے اور وہ دیکھتے رہ گئے (٤٤) پس نہ تو وہ کھڑے ہو سکے

نہ اپنے آپ کو بچا سکے (٤٥) اور نوح کی قوم کو پکڑا اس سے پہلے، وہ نافرمان لوگ تھے (٤٦)

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

(٣٨ - ٤٦)

وفی موسیٰ یعنی اسی طرح موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعات میں اس امر کا نہایت واضح ثبوت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ شریروں سے انتقام لیتا ہے اور اہل ایمان کی مدد فرماتا ہے۔ چنانچہ سورہ شعرا میں ہے۔

وَأَنجَيْنَا مُوسَىٰ وَمَن مَّعَهُ	اور ہم نے نجات دی موسیٰ کو اور ان تمام کو
أَجْمَعِينَ، ثُمَّ أَغْرَقْنَا الْآخَرِينَ	جو اس کے ساتھ تھے، پھر دوسروں کو غرق
إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً	کر دیا، بیشک اس میں نشانی ہے۔

بسلطٰن مبین یعنی قوت اور غلبہ ظاہر کے ساتھ — اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو آیات و معجزات اور غلبہ و ہیبت کی گوناگوں عظمتیں بخشی تھیں، سلطان کے ایک جامع لفظ نے ان سب کو اپنے اندر جمع کر لیا ہے، اور اس کی صفت 'مبین' ہے جو اس جامع لفظ کے لئے نہایت موزوں صفت ہے، قرآن مجید کی دوسری آیات سے بھی اس مضمون کی تائید ہوتی ہے۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ	کہ ہم تمہارا بازو مضبوط کریں گے تمہارے بھائی
وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَانًا فَلَا يَصِلُونَ	کے ذریعہ اور تم دونوں کو کھلا ہوا غلبہ دیں گے پس وہ
إِلَيْكُمَا بِآيَاتِنَا أَنتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا	تم تک نہ پہنچ سکیں گے، ہماری آیتوں کے ساتھ
الْغَالِبُونَ. فَلَمَّا جَاءَهُم مُّوسَىٰ	جاؤ، تم دونوں اور تمہارے پیرو غالب رہیں گے،

بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ ، الآیہ — پس موسیٰ انکے پاس ہماری کھلی نشانیاں لیکر۔

دوسری جگہ ہے ،

فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَا اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ فَاْتِیَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ — پس جاؤ ہماری نشانیاں لیکر، ہم تمہارے ساتھ سننے والے ہیں، فرعون کے پاس جاؤ اور کہو ہم عالم کے پروردگار کے رسول ہیں۔

اور اس کے کچھ ہی بعد فرمایا ہے ،

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَیْءٍ مُّبِیْنٍ قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ. — کہا کیا اگر کوئی کھلی ہوئی دلیل لیکر آؤں جب بھی ! کہا لاؤ، اگر تم سچے ہو۔ . .

. . . .

فتولی برکنہ | یعنی گھمنڈ کی وجہ سے منہ پھیرا۔ رکن یہاں مونڈھے کے معنی میں ہے، اور ب تعدیہ کے لئے ہے۔ دوسری جگہ ہے۔

وَاِذَاۤ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ — جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں منہ موڑتا اور اکڑتا ہے۔

اور اسی کے مشابہ آیت فرعون اور اسکی قوم کے قصہ کے ذیل میں ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰیٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ، وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا — پس جب آئیں ان کے پاس ہماری روشن نشانیاں، انھوں نے کہا یہ کھلا ہوا جادو ہے اور انھوں نے یقین کے باوجود اس کا انکار کیا ظلم اور گھمنڈ کی وجہ سے۔

یعنی ان لوگوں کا انکار کسی شبہ کی بنا پر نہیں تھا، اس لئے کہ دلیل نہایت روشن تھی

بلکہ ان لوگوں نے تکبر اور ظلم و علو کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے منہ موڑا۔

مُلیم | 'الام' کے معنی ہیں کسی ایسے فعل کا مرتکب ہوا جس پر وہ لائق ملامت ٹھہرا پس مطلب یہ ہوا کہ اس وقت فرعون کی بدبختی و نامرادی اس طرح ظاہر ہو گئی کہ جس کو بھی اس کے حال کی اطلاع ہوئی اس کے نزدیک وہ مستحق ملامت قرار پایا۔

الریح العقیم | وہ ہوا جو نہ بارش لائے، نہ اس میں کوئی اور نفع ہو، نفع بخش اور بارش والی ہوا کے لئے عربی میں لواقح کا لفظ ہے۔ وارسلنا الریاح لواقح فانزلنا من السماء ماءً فاسقینٰکموہ۔ ریح عقیم اس کا ضد ہے۔ اس سے مراد سرد ہوا ہے جس کا ذکر قرآن نے مختلف مقامات میں کیا ہے۔ فارسلنا علیھم ریحا صرصرا فی ایام نحسات۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

کالرمیم | پرانی ہڈی اور رسی وغیرہ کے بوسیدہ ٹکڑے اور ریزے۔ اس لفظ کا اطلاق ان میں سے ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو کہنہ اور کمزور ہو جائے۔ تند ہوا کی خصوصیت ہے کہ وہ جن چیزوں پر سے گذرتی ہے ان کو توڑ پھوڑ ڈالتی ہے۔ اور سرد ہوا، ٹھنڈ اور خشکی کی وجہ سے قوت اور تازگی کو ختم کر دیتی ہے۔ اسی کے مشابہ آیت عاد کے بیان میں ہے۔ انا ارسلنا علیھم ریحا صرصرا فی یوم نحس مستمر، تنزع الناس کانھم اعجاز نخل منقعر۔

تمتعوا حتی حین | ثمود نے جب ناقہ کو قتل کر دیا تو ان کے پیغمبر حضرت صالح نے ان کو خبر دی کہ تین دن کے بعد عذاب آجائے گا۔ سورہ ہود میں ہے۔ فعقروھا فقال تمتعوا فی دارکم ثلاثة ایام، ذلک وعد غیر مکذوب

فعتوا عن امر ربھم | عتو کے معنی نافرمانی اور استکبار کے ہیں اور عن کے ساتھ صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہاں اس میں اعراض کا مفہوم بھی پوشیدہ ہے۔

الصٰعقۃ | جن لوگوں کے نزدیک اس کی قرأت الف کے ساتھ ہے انھوں نے اس کو "صیحۃ" (چیخ اور ڈانٹ) کے معنی میں لیا ہے اور اس کی تائید سورہ ہود کی آیت سے بھی ہوتی ہے۔ واخذ الذین ظلموا الصیحۃ۔ اور جن لوگوں نے اس کو بغیر الف کے پڑھا ہے انھوں نے گویا لفظ کی تفسیر کر دی ہے۔ کیونکہ چیخ کی شدت بیہوش کر دینے والی تھی۔ بعد کے اشارات اس کی تائید کرتے ہیں۔

وھم ینظرون | اس میں مختلف پہلو ہیں۔

عذاب بالکل علانیہ اور آشکارا تھا، اس میں کسی طرح کا شک نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا ہے فاخذتھم الصیحۃ بالحق فجعلناھم غثاء۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے۔ واغرقنا آل فرعون وانتم تنظرون۔ اور ہم نے آل فرعون کو غرق کر دیا اور تم دیکھتے تھے، اس کے شواہد بہت ہیں۔

عذاب اچانک آگیا جس کے بعد ان کو فرصت نہیں ملی۔ چنانچہ ان کے ذکر میں ہے۔ انا ارسلنا علیھم صیحۃ واحدۃ فکانوا کھشیم المحتظر۔

وہ عذاب دیکھکر بالکل بے بس اور درماندہ رہ گئے، کوئی تدبیر بن نہیں پڑی اکی وضاحت بعد کے کلام سے ہوتی ہے۔

فما استطاعوا من قیام | کڑاک سنکر ان پر ایسی کپکپی اور دہشت طاری ہو گئی کہ وہ کھڑے نہ رہ سکے، زمین پر گر پڑے۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں فرمایا ہے، فاخذتھم الرجفۃ فاصبحوا فی دارھم جٰثمین۔ یعنی ان کو ایسی کپکپی نے پکڑا کہ وہ زمین پر ڈھیر ہو گئے۔

وما کانوا منتصرین | یعنی اپنے سے عذاب کو دفع نہ کر سکے۔ امرء القیس کا شعر ہے۔

فانشب اظفارہ فی النسا   فقلت ھبلت الا تنتصر

پس اس نے اکی ران میں پنجے گڑو دیئے اور میں نے کہا تیری ماں تجھے روئے، تو کیوں بچا نہیں !

اوپر "فما استطاعوا من قیام" میں جو مضمون پوشیدہ تھا اس ٹکڑے نے اسکو کھولدیا۔

قوم نوح | سابق قصص میں جو مفہوم مراد ہے اس عطف نے اس کو واضح کر دیا اور فرعون کے ذکر میں بھی اس کی وضاحت ہو چکی تھی۔ فاخذناہ وجنودہ ہم نے اس کو اور اس کی فوج کو پکڑا۔ پس مطلب یہ ہوا کہ ہم نے ان قوموں کو پکڑا اور اسی طرح ان سے پہلے قوم نوح کو پکڑا۔ اس کے نظائر سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ فرمایا ہے فکذبوہ فاخذتھم الرجفۃ فاصبحوا فی دارھم جٰثمین وعادا وثمود اس کے بعد فرمایا: وقارون وفرعون وھامان پھر فرمایا۔ فکلا اخذنا بذنبہ الآیہ

اسی کے مشابہ دوسری آیت ہے وانہ اھلک عادا الاولیٰ، وثمود فما ابقیٰ و قوم نوح من قبل یعنی ہلاک قوم نوح، قوم نوح کو ہلاک کر دیا۔ بعینہ یہی اسلوب آیت زیر بحث میں ہے۔ اخذ اور اھلک میں باعتبار حقیقت کوئی ایسا فرق نہیں ہے۔ اس طرح کی تمام آیتوں میں اصلی چیز قرینہ ہے۔ وہ جو مفہوم متعین کر دے وہ لے لیا جائے گا۔

(باقی)

اقسام القرآن

۶

۱۴- استدلالی قسموں میں دلیل کا پہلو

اوپر کی فصلوں میں ہم نے بہت سی استدلالی قسمیں پیش کی ہیں جو نظم و نثر ہر طرح کے کلام اور عرب و عجم سب کے مذاق سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس سے یہ حقیقت تم پر واضح ہو گئی کہ یہ بلاغت کا ایک خاص اسلوب ہے۔ اب اس فصل میں ہم چاہتے ہیں کہ ان استدلالی قسموں کے اندر جو پہلو دلیل کے ہیں ان کی تشریح کریں تاکہ یہ بحث بالکل منقح ہو کر سامنے آجائے۔ یہ بحث اس کتاب کے مہمات مباحث میں سے ہے۔ یہاں صرف چند اجمالی اشارات ہوں گے۔ آگے، جہاں ہم قسم کے ابواب بلاغت کی تفصیل کریں گے، وہاں اس کی مزید وضاحت ملے گی۔

سب سے پہلی بات اس ذیل میں یاد رکھنے کی ہے کہ جب قسم بغرض استدلال کھاتے ہیں تو بسا اوقات اس سے مقسم علیہ کی غایت درجہ وضاحت کو بتانا مقصود ہوتا ہے، مثلاً راعی کا شعر اوپر گزر چکا ہے کہ

ان السماء وان الريح شاهدة　　والارض تشهد والايام والبلد

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ معاملہ شہرت کی اس حد کو پہنچ چکا ہے کہ آسمان و زمین

کی کوئی چیز بھی اس کے ذکر سے ناآشنا نہیں رہ گئی ہے، آسمان کے اطراف اور زمین کے اکناف میں جتنی چیزیں موجود ہیں سب اس کی گواہی دیتی ہیں۔ ہواؤں نے اس کا چرچا گوشہ گوشہ میں پھیلا دیا ہے، اور زمانہ نے صفحات دھر پر اس کے بقاء و دوام کی مہر کر دی ہے، اور اس میں غایت تاکید کا پہلو یہ ہے کہ جب یہ بے جان اشیا اس چیز کی گواہ ہیں تو پھر آنکھ کان والوں کا کیا ذکر، وہ تو بدیہی طور پر اس کے جاننے والے اور بیان کرنے والے ہوں گے۔

یہ بظاہر ایک مبالغہ کا اسلوب ہے، لیکن درحقیقت اس کی بنا واقعیت پر ہے کیونکہ مراد اس سے مقسم علیہ کی غایت شہرت اور اس کے متعلق عام علم و واقفیت کا اظہار ہے۔ اوپر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جو قسم گزر چکی ہے وہ بھی اسی باب سے تعلق رکھتی ہے، انھوں نے بھی آسمان و زمین کو گواہ ٹھہرایا ہے۔

کبھی بطریق تشبیہ مثال دینا مقصود ہوتا ہے اور اس صورت میں درحقیقت متکلم کی طرف سے ایک ادعا پنہاں ہوتا ہے، اس کی مثال عروہ بن ورد کی قسم ہے۔ قبیلہ کرجس کے سامنے ابو امامہ نے فریاد کی تھی، اس کی مثال عروہ نے "مرخة" (ایک بے سایہ درخت) سے دی ہے۔ یہ مثال محض ادعا ہے، لیکن دعویٰ جب بطریق اشارہ پیش کیا جاتا ہے تو مخاطب اس کو نہایت آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ تشبیہ و کنایہ میں بھی یہی بات ہوتی ہے اور اس کی تفصیلات کتب معانی میں موجود ہیں۔ ہم انشاءاللہ سترہویں فصل میں اس کی مزید تشریح کریں گے۔

بعض اوقات قول کی تائید مقصود ہوتی ہے اور چونکہ مقسم بہ سے مقسم علیہ کی تائید ہوتی ہے اس لئے اس کی قسم کھاتے ہیں۔ اس کی مثال بولیس کے کلام میں موجود ہے۔ جس تاج سے قوم نے اس کی عزت افزائی کی تھی اسی کو اس نے شہادت میں پیش کیا ہے کہ

قوم کی نظروں میں عزت کی سب سے بڑی چیز یہ تاج ہے اور جب میں نے یہ دائمی فخر اپنے لئے قوم کی طرف سے مخصوص کرا لیا تو میرا کوئی حاسد کیسے کہہ سکتا ہے کہ میں اپنی قوم سے نفرت کرتا ہوں۔

لیکن اس استدلال میں ایک کمزوری تھی۔ اس کا مخالف کہہ سکتا تھا کہ قوم کی طرف سے اس عظیم الشان عزت افزائی کے باوجود تم نے احسان فراموشی کی۔ اس کے لئے اس نے تاج کے ذکر کے ساتھ اپنے شرف نفس کا بھی حوالہ دیا کہ میں نے یہ عزت سب سے بڑی قومی جنگ میں حاصل کی ہے، جس میں قوم کے تمام سرداروں نے اپنے اپنے جوہر دکھائے، لیکن کوئی بھی میرے رتبہ کو نہیں پہنچ سکا۔ اس تاکید مزید کے بعد صرف وہی شخص بولیوس پر شبہہ کر سکتا ہے جو حاسد ہو اور جس کو بڑوں کے ساتھ سوءِ ظن رکھنے کی خو ہو لیکن اس کے باوجود یہاں دعویٰ اور دلیل میں پوری پوری مطابقت نہیں ہے۔

بعض اوقات دعویٰ پر ایک قاطع حجت پیش کرنا مقصود ہوتا ہے اور اس کیلئے بالعموم یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ کسی ایسی چیز کو پیش کرتے ہیں جو مقسم بہ اور مقسم علیہ کے درمیان ایک جامع کی حیثیت رکھتی ہو۔ اس کی مثال ڈیموس تھینیز کی قسم ہے۔ اس نے پہلے اسلاف کے وہ کارنامے بیان کئے جن کی عظمت مخاطب کے نزدیک مسلم ہے اور پھر انہی کارناموں کو ان لوگوں کے حسن عمل کے ثبوت میں پیش کیا ہے جنھوں نے اپنے پر فخر اسلاف کے نقش قدم کی پیروی کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے شروع ہی میں کہا کہ "تمھارے لئے تمھارے اسلاف کے روشن کارناموں میں نمونہ ہے"۔

اور اس میں شبہہ نہیں کہ اس طرح کی قسموں میں سب سے زیادہ بلیغ اسلوب یہی ہے جو ڈیموس تھینیز نے اختیار کیا۔

۵۔ بعض دلائل قرآن مجید سے

یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ قسم سے اصل مقصود استشہاد ہے۔ تعظیم صرف اس صورت میں پیش نظر ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ اور اس کے شعائر کی قسم کھائی جائے بلکہ اس صورت میں بھی بعض اوقات، جیسا کہ اوپر ہم دکھا چکے ہیں، صرف استدلال مقصود ہوتا ہے۔ پس ان باتوں کے واضح ہو جانے کے بعد اب اس امر میں شبہہ کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ قرآن کی وہ قسمیں، جن پر معترض نے دو آخری شبہے وارد کئے ہیں، تمام تر استشہاد و استدلال کے لئے ہیں۔

اگر کوئی معترض یہ کہے کہ ہم مانتے ہیں کہ قسم کی اصل شہادت کے لئے ہے لیکن چونکہ اس کا استعمال زیادہ تر تعظیم کے لئے ہے اس لئے اب اس کا یہی مفہوم باقی رہ گیا ہے اور اصل مفہوم یعنی شہادت بالکل غائب ہو گیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ غیر اللہ کی قسم کی ممانعت وارد ہے۔ پس اس کے اصل مفہوم کا لحاظ اب صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے، جب کوئی قوی دلیل اس کے لئے موجود ہو۔

اس اعتراض کا جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ یہ ہم تسلیم کرتے ہیں لیکن اقسام قرآن کے اس خاص مفہوم کی طرف ہماری تو یہ خود قرآن کی رہنمائی سے ہوئی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ان میں سے بعض دلائل ہم یہاں بیان کریں۔

۱۔ قرآن نے ایک ہی لفظ کبھی بندہ کے لئے استعمال کیا ہے اور کبھی اللہ تعالیٰ کیلئے۔ ایسی صورت میں لامحالہ لفظ کے مختلف مفاہیم میں فرق کرنا پڑتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہ ہو جائے جو اس کی عظمت و تقدیس کے منافی ہے۔

مثلاً صلوٰۃ جب بندہ کی طرف سے ہو تو دعا کے معنی میں ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو تو رحمت کے مفہوم میں ہے۔ اسی طرح شکر بندہ کی طرف سے اعتراف نعمت ہے اور خدا کی طرف سے ہماری نیکیوں کی پذیرائی ہے۔ یہی حال توبہ، سخط، مکر، کید، اسف، حسرۃ وغیرہ الفاظ کا ہے۔ بلکہ حق ہے کہ ہماری لغت کا کوئی لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس کو ہم اس فرق کے لحاظ کے بغیر اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال کرتے ہوں۔ ہم تمام الفاظ میں یہی کرتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال کرتے وقت ان کے صرف انہی معانی کو سامنے رکھتے ہیں جو خدا کی ذات برتر کے شایان شان ہوں۔ بعینہٖ یہی طریقہ ہم نے قسم میں اختیار کیا، اس کے مختلف پہلوؤں میں سے جو پہلو ہم کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے مناسب نظر آیا وہ ہم نے اختیار کر لیا۔ ھو خیر و احسن تاویلا۔

۲۔ حمل نظیر علی النظیر اور تفسیر آیات بالآیات کا اصول بھی اس کی طرف رہبری کرتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن کبھی تو دلائل و آیات کو سیدھے سادے اسلوب پر بیان کرتا ہے اور کبھی ان کے لئے قسم کا اسلوب اختیار کر لیتا ہے اور مقصود دونوں صورتوں میں اہل نظر کے سامنے استشہاد ہوتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	آسمانوں اور زمین کی پیدائش، رات اور دن
وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ	کی آمد و شد، اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کیلئے
الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ	نفع رساں سامان لیکر سمندروں میں چلتی ہیں
وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ	اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا اور
مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ	اس سے زمین کو اس کے خشک ہونے کے
مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ	بعد شاداب کیا اور اس میں طرح طرح کے جانور

وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ	پھیلائے اور ہواؤں کی گردش اور آسمان
الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ	و زمین کے درمیان بادلوں کی تسخیر میں عقلمندوں
لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ	کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

اس طرح کی آیتیں قرآن مجید میں بہت ہیں اور ان سب کا مقصود استشہاد و استدلال ہے۔ پھر غور کرو گے تو دیکھو گے کہ بعینہٖ یہی چیزیں ہیں جن کو قرآن نے بطریق قسم شہادت میں پیش کیا ہے، قسم والی آیات پر ایک نظر ڈال کر دیکھو وہ کیا چیزیں ہیں؟ آسمان، زمین، سورج، چاند، رات، دن، فجر، وقت چاشت، ہوا، ابر، پہاڑ، سمندر، شہر، انسان، باپ، بیٹا، نر، مادہ، جفت، طاق وغیرہ وغیرہ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ وہی چیزیں ہیں جو سادہ اسلوب میں بطور دلیل و شہادت پیش کی جاتی ہیں۔ پس ان کے دلیل ہونے کے ثبوت میں خود قرآن مجید کے نظائر موجود ہیں اس لئے ان کو تعظیم کے مفہوم میں لینا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

۳۔ خود قسم بھی اس دعویٰ کی تائید کرتا ہے کیونکہ کوئی عاقل ایک لمحہ کیلئے بھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ خود اپنی پیدا کی ہوئی بعض چیزوں کو ایک معبود مقدس کی حیثیت دیدے گا۔ بالخصوص جبکہ چیزیں بھی ایسی ہوں جن میں تقدس کا کوئی خاص پہلو موجود نہ ہو۔ مثلاً دوڑنے والے گھوڑے، غبار اڑانے والی آندھی، وغیرہ وغیرہ اس کے برعکس قرآن نے ان تمام چیزوں کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ یہ سب مطیع و منقاد اور خلق کی نفع رسانی کے لئے مسخر ہیں۔ پس مجرد ان چیزوں کی قسم کھانا ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ اس کو محض بطور شہادت کے پیش کیا گیا ہے۔

۴۔ مقسم بہ اور مقسم علیہ میں بالعموم نہایت واضح مناسبت موجود ہوتی ہے۔ قرآن

نے ان قسموں کو ایسے قالب میں پیش کیا ہے کہ صاحب نظر با دنیٰ تامل مقسم علیہ کے ساتھ ان کے تعلق کو پا لیتا ہے۔ صاحب تفسیر کبیر قسم کو تعظیم کے لئے سمجھتے ہیں چنانچہ اسی خیال کے ماتحت انھوں نے انجیر و زیتون کے فضائل بیان کرنے میں بڑا زور قلم صرف کیا ہے۔ تاہم سورہ ذاریات کے شروع میں جو قسمیں وارد ہیں ان کے اندر دلیل و شہادت ہونے کی ایک جھلک ان کو بھی نظر آئی ہے چنانچہ انھوں نے لکھا ہے کہ انھا کلھا دلائل اخرجھا فی صورۃ الایمان۔ یہ سب دلائل ہیں جو بصورت قسم پیش کئے گئے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر امام رازی قرآن کی ان تمام قسموں پر، جو استدلال کیلئے آئی ہیں، غور کرتے تو وہ سب میں شہادت ہی کے پہلو کو ترجیح دیتے۔

۵۔ جس طرح کی تعمیم قرآن مجید میں عام آیات و دلائل کے بیان کے سلسلہ میں ہے بعینہ اسی قسم کی تعمیم و وسعت بعض جگہ مقسم بہ میں بھی موجود ہے۔ مثلاً فرمایا ہے۔ اقسم بما تبصرون وما لا تبصرون ۔ میں قسم کھاتا ہوں اس چیز کی جس کو تم دیکھتے ہو اور اس چیز کی جس کو تم نہیں دیکھتے۔ اس قسم میں جملہ کھلی چھپی چیزوں کو سمیٹ لیا ہے۔ اور یہ وہی تعمیم ہے جو وان من شیئ الا یسبح بحمدہ (نہیں ہے کوئی شے مگر اس کی تسبیح کرتی ہے حمد کے ساتھ) میں ہے۔ اور اسی تعمیم سے ملتی جلتی بات یہ ہے کہ جہاں قسم کھائی ہے وہاں متقابل چیزوں کا ذکر کیا ہے یعنی روز اور شب، زمین اور آسمان۔ پس کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کی اس عموم کے ساتھ تعظیم فرمائی ہو؛ البتہ ان کو دلیل و شہادت کے طور پر ذکر کرنے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے پس اس راہ کے سوا کوئی اور راہ اختیار کرنا ہمارے نزدیک بالکل غلط ہے۔

۶۔ بعض جگہ مقسم بہ کے بعد ایسی تنبیہات بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو

اہل نظر کے سامنے بطور دلیل و شہادت پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً والفجر۔ ولیال عشر، والشفع والوتر، واللیل اذا یسر، ھل فی ذلک قسم لذی حجر۔ اس میں آخری ٹکڑا ھل فی ذلک قسم لذی حجر۔ (کیا اس میں ایک عاقل کے لئے شہادت ہے) بالکل اسی طرح کی بات ہے جیسی کہ بالعموم دلائل کے ذکر کے بعد قرآن میں آتی ہے۔ مثلاً سورہ نحل میں بہت سے دلائل کے بعد فرمایا ان فی ذلک لآیٰت لقوم یعقلون۔ اس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لئے۔ سورہ طٰہٰ میں ہے ان فی ذلک لآیٰت لاولی النھی بیشک اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اہل عقل کے لئے۔ آل عمران میں ہے۔ ان فی ذلک لعبرۃ لاولی الابصار بے شک اس میں سامان عبرت ہے اہل بصیرت کے لئے۔ اسی عام اسلوب کے مطابق سورہ فجر میں بھی قسمیں کھانے کے بعد اشارہ فرما دیا کہ ان قسموں کے اندر اہل عقل و بصیرت کے لئے بہت سے دلائل مضمر ہیں۔

سورہ واقعہ کی تنبیہ بھی اس سے ملتی جلتی ہوئی ہے۔ فرمایا فلا اقسم بمواقع النجوم وانہ لقسم لو تعلمون عظیم۔ یعنی اسمیں بہت بڑی دلیل اور ایک عظیم الشان شہادت ہے۔ یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ قسم کی بڑائی کی تصریح فرمائی ہے مقسم بہ کی عظمت کا کوئی ذکر نہیں فرمایا۔

۷۔ بالعموم مقسم بہ کا ذکر ایسے صفات کے ساتھ ہوتا ہے کہ اس سے استدلال مترشح ہوتا ہے، مثلاً "والنجم اذا ھوی" "فلا اقسم بالخنس الجوار الکنس" "والصٰفٰت صفا، فالزاجرات زجرا۔ فالتالیات ذکرا۔" "والذاریات ذروا فالحاملات وقرا فالجاریات یسرا فالمقسمات امرا" "ولا اقسم بالنفس اللوامۃ"۔ غور کرو تاروں کا گرنا، اور پیچھے ہٹنا۔ ملائکہ کی صف بندی، ہواؤں کی غبار انگیزی اور تقسیم امر، نفس

کی ملامت گری، ان باتوں کو استدلال سے زیادہ تعلق ہے یا تعظیم سے!

۸۔ بعض مقامات میں ایسا ہے کہ قسم سے پہلے عام دلائل و آیات کا ذکر ہوا ہے۔ پھر اس کے بعد قسم بہ ایسے انداز سے آیا ہے کہ انگلی اٹھا کر تمام پچھلی دلیلوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے گویا استدلال کا جو پہلو مدنظر تھا اس کی تمہید پہلے سے جما دی گئی تھی۔ ایسے مواقع نظم قرآن کے طالب کے لئے بڑے ہی نشاط انگیز ہوتے ہیں۔ اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہئے۔

سورہ ذاریات میں فرمایا ہے۔ وفی الارض آیٰت للموقنین، وفی انفسکم افلا تبصرون، وفی السماء رزقکم وما توعدون (اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لئے اور تمہارے نفس کے اندر بھی کیا تم دیکھتے نہیں، اور آسمان میں تمہاری روزی ہے اور وہ چیز جس کا تم وعدہ کئے جاتے ہو) یعنی آسمان و زمین میں ربوبیت اور جزا کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں، جیسا کہ دوسرے مقامات میں اس کی تفصیل فرمائی ہے۔ پھر آسمان و زمین کے دلائل جزا کا حوالہ دینے کے بعد فرمایا فورب السماء والارض انہ لحق مثل ما انکم تنطقون (پس آسمان و زمین کے رب کی قسم بے شک وہ واقع ہونے والی بات ہے جس طرح کہ تم بولتے ہو۔ (وہ یعنی جزا جن لوگوں نے بیان قرآن مراد لیا ان کا خیال صحیح نہیں ہے)

اس قسم پر پھر غور کرو، اس میں تعظیم کا پہلو موجود ہے، کیونکہ قسم اللہ تعالیٰ کی کھائی گئی ہے، لیکن اس کے باوجود اس میں آسمان و زمین کی نشانیوں سے استدلال کا پہلو نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ چنانچہ مقسم کا ذکر ایسی صفت کے ساتھ کیا گیا ہے جو ما سبق استدلال کی طرف خود اشارہ کر رہی ہے۔ اور چونکہ اس میں تعظیم کا پہلو زیادہ ابھرا ہوا تھا، جو ممکن تھا کہ استدلال کے پہلو کو دبا دیتا اس لئے مناسب ہوا کہ استدلال کی تمہید پہلے سے

استوار کی جائے۔

ممکن ہے اس ساری بحث کے بعد بھی کسی کے دل میں یہ خلش رہ جائے کہ جب اصل حقیقت یہ تھی تو پچھلے علماء پر کیوں مخفی رہی؟ اور جو بات آج تک کے علماء نے نہیں لکھی اس بات پر دل کیسے مطمئن ہو؟ اس شبہ کا جواب ..... ہم ان شاء اللہ اگلی فصل میں دیں گے۔

(باقی)

فاتحہ نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان

عربی

یہ کتاب استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ کی تین تفسیروں کا مجموعہ ہے۔ مقدمہ تفسیر نظام القرآن، تفسیر سورہ بسم اللہ، تفسیر سورہ فاتحہ۔ مقدمہ میں مولانا نے اپنی تفسیر کے تمام اصول بیان کئے ہیں۔ اور ان تمام اصولی مباحث سے تعرض کیا ہے جنکی قرآن پر تدبر کرنے والے طالب علم کو ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ اصولی مباحث ۱۰ ہیں۔

آخر میں بسم اللہ الرحمن الرحیم اور سورہ فاتحہ کی تفسیر ہے۔ ان تفسیروں میں مصنف نے جو حکیمانہ نکات و حقائق بیان کئے ہیں، وہ مطالعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

جو لوگ قرآن مجید کو محققانہ طریق پر سمجھنا چاہتے ہیں ان کیلئے اس مقدمہ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ باطنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ظاہری کتابت و طباعت اور کاغذ کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت:- بارہ آنے

"منیجر"

مقالات

فلسفۂ اجتماع

از جناب مولانا عبداللہ رشید نواز شبؔ کی خطیب جامع مسجد سوتی رنگون

انسان کا وجود بظاہر کرشمہ ہے نفس اور مادہ کے اتحاد و ارتباط کا!! اور مادہ مشتمل ہے مختلف عناصر پر!! جنکی کمیت اور کیفیت کے مختلف مقدار میں الگ الگ ترکیب پانے کا نام تشخص ہے، افراد کا تعدد اور اختلاف انہی تشخصات کا امتیازی اور استقلالی وجود ہے۔ مگر درحقیقت انسان کی ہستی، کائنات عالم کے جملہ صفات اور فطری میلانات کا مظہر ہے، اس کا وجود تطور (ارتقاء) کے وہ تمام منازل طے کرتا ہے جو فرداً فرداً جمادات، نباتات، اور حیوانات کو طے کرنے لازمی ہیں۔ اس کی ذات میں تینوں قسم کے میلانات پائے جاتے ہیں، اور اس کا نفس نہ صرف ان تینوں قسم کے میلانات ہی کی رہنمائی کرتا ہے بلکہ اسے اپنے فطری میلانات کی بھی رہبری کرنی پڑتی ہے۔ یہی رہبری اسکی زندگی کے تیسرے دور میں اسے تجربہ، استنباط، اور نظر و استدلال کے قابل بناتی ہے۔

نفس انسانی جسم میں ایک ایسا حکمراں ہے جس کی آزادی مشروط ہے، ہر انسان پر اس کی طبیعت، مزاج، اور مادہ کی صلاحیت کے مناسب حال نفس کی یہ مشروط

حکومت قائم ہے، نفس کی مشروط آزادی کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اس کا تعلق جسم سے قائم ہے۔ مادیات کے قوانین کی پابندی اس پر لازم ہے۔ اس کے مبادلہ اور معاوضہ میں مادیات نفس کے مقاصد کی تکمیل میں، بشرطیکہ دونوں میں تصادم نہو، اپنی پوری قوتوں کے استعمال کا نفس کو مجاز تسلیم کرلیتی ہیں۔ اور اس فطری معاہدہ کی خلاف ورزی کی صورت میں نفس اور مادہ میں سے ہر ایک کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی امداد و تعاون سے ہاتھ کھینچ لیں۔

نفس انسانی جس میں فطرت کی طرف سے تمدن و تعلم کا غیر فانی اور لامحدود جذبہ ودیعت کیا گیا ہے، اپنی فطری پیاس کی بنا پر مضطر ہے کہ مادیات اور روحانیات کی حدود کو عبور کرنے کی جد و جہد میں لگا رہے اور اپنی اس دائمی پیاس کو، جس کا فنا ہوجانا انسانیت کی موت ہے، کبھی نہ بجھنے دے۔

یہی جذبہ، قوائے عقلیہ کے ارتقاء کا باعث ہے!!

قوائے عقلیہ کا ارتقاء اور اس کے عناصر ترکیبی (پہلا دور)

انسان چونکہ مدنی الطبع ہے اس لئے اس کی تکوین و تخلیق اور اس کے قوائے عقلیہ کی تہذیب و اصلاح میں بظاہر تین موثر قوتیں کارفرما نظر آتی ہیں اور ہر قوت کا باعتبار غلبہ کے ایک خاص دور ہے۔

(۱) فطری میلان یا فطری الہام۔ (۲) تربیت و تعلیم یا تقلید و نقل۔ (۳) تجربہ و استنباط یا معلوم کے ذریعے نامعلوم کے جاننے کی قوت کے استعمال کا دور۔

فطری میلان یا الہام سے اگرچہ انسان کسی دور میں بھی بے نیاز نہیں ہوتا، مگر ابتدائی دور میں یہ قوت انسان کی جملہ حرکات و سکنات میں اس کی رہنمائی کرتی رہتی ہے اور جس طرح دیگر حیوانات کی جنہیں طبعی طور پر تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی کفالت کیا کرتی ہے۔

اسی طرح کم و بیش تربیت و تعلیم کے اثرات قبول کرنے تک انسان کی ضروریات کی بھی ایک حد تک کفیل رہتی ہے۔ اس سے پہلے دور میں وہ نہ صرف رہنما ہوتی ہے بلکہ مربی اور معلم بھی!! بچہ میں اس فطری رہنمائی کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

دوسرا دور تربیت و تعلیم کا دور شروع ہوتے ہی اس رہنمائی کی نوعیت بدلنے لگتی ہے۔ نفس انسانی اس چھوٹی سی سلطنت کی داغ بیل ڈالنے کے لئے جس میں اسے ایک گونہ استقلال حاصل ہونے والا ہے، بچپن اور خارجی تربیت و تعلیم کے اثرات قبول کرنے کے لئے ہمہ تن چشم و گوش بن جاتا ہے، اس وقت یہ فطری میلان اسے ان اثرات کو جلد از جلد قبول کرنے پر ابھارتا ہے۔

گہوارہ کی موزونیت یا غیر موزونیت، ماحول کی مناسبت یا عدم مناسبت، مظاہر کی بہتری اور بدتری سے اسے بظاہر کوئی خاص لگاؤ نہیں ہوتا اور بجز چند مافوق الفطرت یا خارق عادات مثالوں کے، وہ اسے اسی ماحول کے مناسب حال، جس میں وہ پایا جاتا ہے، تربیت دیدیتا ہے۔ انسان کے تمام فطری ملکات، اس کے قوا، افعال، عادات، اطوار، خیالات سب اسی ماحول کے سانچے میں ڈھل جایا کرتے ہیں۔

تیسرا دور اس دوسرے دور کے ختم ہوتے ہوتے تیسرا دور شروع ہو جاتا ہے۔ یہ دور عقلی تجربہ اور استنباط کا دور ہے، اس کی ابتدا اگرچہ دوسرے دور ہی سے شروع ہو جاتی ہے مگر اس کا ظہور اس کے اختتام پر ہوتا ہے۔ اختتام سے مراد اس دور کے خصوصیات کا مغلوب ہو جانا ہے۔ جس طرح پہلے دور کی خصوصیات یا اثرات دوسرے دور میں کمزور اور دھندلے نظر آتے ہیں، اسی طرح دوسرے دور کی خصوصیات اس تیسرے دور میں دھندلی پڑ جاتی ہیں۔

تینوں دوروں کا باہمی ربط مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر پہلا دور اپنے بعد کے دور کے طے کرنے کی صلاحیت یا اہلیت پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ یعنی ہر پچھلے دور کی ترقی اس سے پہلے دور کی اصلاح اور درستگی یا کامل آمادگی پر موقوف ہے۔

تیسرے دور کے نتائج فطری میلان یا الہام کی رہنمائی اور تربیت و تعلیم کے صحیح یا غلط اصول کے استعمال اور مواقع انسان کو اس تیسرے دور میں داخل ہونے کے قابل یا ناقابل بناتے ہیں، اگر اس تیسرے دور میں انسان کامل تربیت پا کر داخل ہوتا ہے تو وہ اپنی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کرکے مرئیات، مشاہدات اور مظاہر قدرت میں غور و فکر کے اعلیٰ منازل طے کرنے شروع کر دیتا ہے۔ وہ پچھلے دور میں صرف مامور و محکوم تھا، دوسرے دور میں ناقل و مقلد بنا، اب تیسرے دور میں حاکم و آمر اپنی سلطنت کے حل و عقد کا مالک اور کائنات عالم میں متصرف بن جاتا ہے، اس کا دماغ تجربہ، تحلیل و تجزیہ، جزئیات، کلیات، فروع و اصول میں استنباط، استخراج اور اجتہاد سے کام لینے لگتا ہے اور قوت استدلال کیلئے حقایق کی تلاش میں سرگرم نظر آتا ہے۔

جسمانی اور عقلی قوا کا اعتدال، فطرت کی دین اور موروثی دولت ہے جو تربیت و تعلیم سے صیقل پا کر انسان کو مظاہر قدرت اور اسلاف کے علمی تجارب اور ذخیروں سے فائدہ اٹھانے کے لائق بنا دیتی ہے، اس استعداد کے بعد اپنے اس تیسرے دور کی خصوصیات سے انسان متمتع ہونے لگتا ہے، ہر لمحہ معلوم کے ذریعہ سے نامعلوم اشیاء کے جاننے کی ضرورت اسے محسوس ہوتی ہے۔

فطری میلان کی طبعی تقسیم فطری میلان یا طبعی و فطری الہام کی، باعتبار ان کے

اثرات کے مختلف نوعیتیں ہیں، بعض میلانات ایسے ہیں جن میں تمام حیوانات کم و بیش شریک ہیں اور انسان بھی بوجہ اس کے کہ ایک جاندار مخلوق ہے ان میلانات میں جملہ حیوانات کا شریک اور حصہ دار ہے، کچھ میلانات ایسے ہیں جن میں انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز نظر آتا ہے، اور وہ صرف انسانوں ہی میں پائے جاتے ہیں۔ تقریباً تمام انسان ان میلانات میں کم و بیش شریک ہیں، اگرچہ کسی میں کوئی میلان زیادہ اور کسی میں کم ہوتا ہے۔ اس کمی و بیشی کے اسباب کا شمار دشوار ہے۔

انسان خواہ کروڑوں سال سے دنیا میں پایا جاتا ہو یا چند ہزار سال سے، یہ بات مانی ہوئی ہے کہ دور اول اس کائنات کا نہایت سادہ اور متشابہ و مماثل تھا۔ افراد سے خاندان اور خاندان سے قومیں آباد ہوئیں۔ پھر مختلف خاندانوں کے میل جول سے جس طرح نئے خاندان پیدا ہوئے اسی طرح بعض قوموں کے امتزاج سے نئی قومیں وجود میں آئیں۔ بعض خاندان یا افراد جب اپنی قوم اور ملک سے نکل کر دوسرے ملکوں میں جا کر بسے یا دوسری قوموں میں مل گئے تو ان کی وہ پہلی خصوصیات، عادات، اطوار، تربیت کی نوعیت، جسمانی قوا، میلانات، زبان اور وہ تمام امتیازات جن کی وجہ سے وہ علیحدہ ایک قوم یا کسی قوم کے افراد سمجھے جاتے تھے، رفتہ رفتہ بدل گئے۔ دنیا میں اقوام کی صورت و سیرت، اخلاق و عادات، جسمانی قویٰ، رنگ روپ، فطری رجحانات یا میلانات اور زبانوں کی کثرت اور ان کے اختلاف کی بظاہر یہی وجہ ہے۔

نفس اور جسم کا تعلق اور حواس کی نوعیت نفس اور جسم کے تعلق یا رابطہ کا نام زندگی ہے۔ جسم بغیر نفس کے تعلق کے جماد محض ہے۔ زندگی کی اولین شرط احساس و ادراک ہے۔ احساسات کا مرکز اصل میں نفس ہے۔ جسم محسوسات اور نفس کے درمیان آلہ کار اور واسطہ ہے۔ اسی طرح

بعض محسوسات ایسے بھی ہیں جن میں نفس واسطہ ہے اور جسم احساس میں اس کا تابع ہے۔ محسوسات یا تو مجسم ہیں اور یا کیفیات و معانی! ان محسوسات کی تعداد کی وجہ سے حواس بھی متعدد مانے جاتے ہیں اور جو چیزیں مادیات سے بالاتر ہیں ان کا ادراک خود نفس کرتا ہے۔ حواس ظاہری جو جزئیات، مشاہدات اور بعض کیفیات کا ادراک کرتے ہیں، پانچ ہیں۔ اسی طرح حواس باطنی بھی پانچ ہی مانے جاتے ہیں جن کے مختلف کام اور مختلف نام ہیں۔ یہ پانچوں قوتیں دماغ کے مختلف حصوں میں منقسم ہیں۔ انہی کے ذریعہ سے گزشتہ واقعات اور صورتوں کی یاد تازہ رہتی ہے۔ ان کے صفات و خواص محفوظ رہتے ہیں، معانی کا ادراک، ان میں فکر و غور اور معلوم سے نامعلوم کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ حواس باطنی کا تعلق ایک طرف نفس سے ہے جو غیر مادی ہے اور ایک طرف حواس ظاہری سے ہے جو اعضائے ظاہری میں پائے جاتے ہیں اور مادی ہیں۔ نفس تابع بھی ہے اور متبوع بھی! اکثر اسے حواس ظاہری کا تابع بننا پڑتا ہے اور کبھی حواس ظاہری اس کے تابع ہوتے ہیں اور وہ متبوع ہوتا ہے۔ مادیات میں انہماک کے اسباب نفس کو مادیات میں تصرف و انہماک پر مجبور کرتے ہیں اور غیر مادیات میں انہماک کی ضرورت کا احساس جب نفس کو زیادہ ہوتا ہے تو وہ حواس کو اپنا تابع کر لیتا ہے۔ اور ظاہری یا جسمانی محسوسات سے کسی قدر بے تعلق ہو جاتا ہے۔

حواس کا توازن جن نفوس میں مقاصد زندگی کا احساس اپنی اصلی حالت پر پایا جاتا ہے اور جن کے حواس مادی، غیر مادی حواس سے مغلوب نہیں ہوتے نہ غیر مادی حواس، مادی حواس کے تابع ہو کر فنا ہو جاتے ہیں، وہ نفس و جسم کے امتزاج کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں وہ اس تمام مجموعہ معلومات سے نتائج اخذ کرتے ہیں، ان میں تطبیق دیتے ہیں، مفید و مضر میں امتیاز کرتے ہیں تاکہ اپنے جسمانی تعلق کو برقرار رکھنے کے اسباب

کی تحصیل کریں اور اس کے فنا کرنے والے امراض سے بچیں۔

فطری میلان کا تطور

فطری یا طبعی میلان و رجحان کا بنتا، سنورنا، بگڑنا، اور فنا ہونا افراد و اقوام کے قوائے جسمانی و دماغی کی اچھی یا بری تربیت کے تابع ہے۔ جس قوم کے قوائے جسمانی و دماغی کی تربیت کا نظام زیادہ مکمل اور منظم و محفوظ ہوگا، اس قوم کے افراد کے فطری میلان و رجحان میں زیادہ یکسانی و پختگی پائی جائے گی، اور جس قوم کی دماغی و جسمانی تربیت کا نظام غیر مکمل، ناقص، منتشر یا مفقود ہوگا اس کے فطری میلان و رجحان میں بھی خامی اور ابتری پیدا ہو جائے گی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فطری میلان بھی تطور پذیر ہے اور اس کے تطور کے لئے قوموں کا تطور و تمدن لازمی ہے۔

جسم کا انفرادی اور اجتماعی نظام

انسان کی ترکیب مختلف عناصر سے ہوئی ہے اور جسم مختلف المزاج اعضاء سے مرکب ہے۔ مزاج کا اختلاف، اعضا کی ساخت اور ہر عضو کے اجزاء کے اختلاف کی وجہ سے ہے، اس لئے ہر عضو کی غذا اور اس کی صحت برقرار رکھنے کے اسباب بھی مختلف ہیں۔ ہر عضو کی صحت کا اعتدال پر قائم رہنا اس کی ساخت اور مناسب مزاج غذا کے پہنچنے اور اس کے متعلقہ قوانین صحت کی پابندی پر موقوف ہے۔ جسم انہی اعضاء کی اجتماعی یا ترکیبی صورت کا نام ہے۔ اس اجتماعی صورت میں تناسب اور توازن، مختلف اعضاء کا باوجود اختلاف طبائع کے، ایک نظام خاص کے ماتحت جسم کی اجتماعی زندگی اور اس کے جملہ مقاصد کی تکمیل و تحصیل میں اشتراک و تعاون جسم کی صحت و اعتدال کی دلیل ہے۔

نوامیس فطرت یا سنت اللہ کی خلاف ورزی کے نتائج

نفس انسانی میں اپنے تحفظ اور بقا کا جذبہ فطرۃً مرکوز ہے۔ مشاہدات و تجارب نے اس جذبہ کی

مدد سے نفس کو قوانین صحت کے استنباط پر ابھارا اور انسان چونکہ تنازع للبقا کے قانون کے ...... ماتحت اپنے تحفظ پر مامور ہے اس لئے اس نے مظاہر قدرت اور خود اپنی ذات میں غور و فکر کر کے شخصی اور اجتماعی زندگی کے بقا و تحفظ کے اسباب اور اس کے مخالف شخصی اور اجتماعی امراض کو سمجھا اور اسے مدون و مرتب کیا، یہ جو کچھ ہوا فطری الہام کی رہبری سے ہوا۔ اس لئے ان مرتب شدہ قوانین صحت کی خلاف ورزی درحقیقت قانون قدرت ہی کی خلاف ورزی ہے اور سنت اللہ یہ قرار پاگئی ہے کہ اعمال کے نتائج اچھے ہوں یا برے ظاہر ہو کر رہتے ہیں اور نہ صرف یہی کہ افراد تک ان نتائج کا اثر محدود رہتا ہے بلکہ افراد کی آئندہ نسلوں میں بھی یہ اثرات وراثۃً منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

قوموں کا انفرادی اور اجتماعی تعاون

ہر فرد کو اپنے خاندان سے، ہر خاندان کو اپنی قوم سے اور ہر قوم کو مجمع انسانی سے وہی نسبت ہے جو جزو کو کل سے اور ہر عضو کو پورے جسم سے ہوتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ صحرا کا وجود، ذروں کے اجتماع کا نتیجہ، اور دریا کی ہستی قطروں کے اتحاد کا ثمرہ ہے۔

اقوام عالم کا تمدن و حضارت کے میدان میں دوش بدوش ترقی کرتے رہنا مجمع انسانی کے توازن اور اس کی وحدت قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ جس طرح ہر عضو کا بقا انفرادی و اجتماعی دو قسم کے نظاموں سے وابستہ ہے، اسی طرح افراد اور قومیں بھی اپنے تحفظ اور بقا کے لئے دو قسم کے نظاموں کی محتاج ہیں۔ ان دونوں نظاموں کا باہمی رابطہ اس قدر مستحکم ہے کہ ان میں کسی قسم کا تقدم یا تاخر ممکن نہیں ہے۔ ہر فرد اور قوم پر بیک وقت اپنی انفرادی خصوصیات کی نگہداشت بھی لازمی ہے اور مجمع انسانی کا ایک ممبر ہونے کی حیثیت سے نظام اجتماعی کی متابعت بھی! انفرادی خصوصیات کا

تحفظ بدون نظام اجتماعی کے تحفظ کے ممکن ہے اور نہ کوئی اجتماعی نظام بدون افراد کی انفرادی خصوصیات کی حفاظت کے قائم رہ سکتا ہے۔ افراد کا اپنی اپنی استعداد کے مطابق زندگی کی مختلف شاخوں میں منہمک ہونا اصولاً تقسیم عمل ہے۔ اگر یہ تقسیم عمل ایک خاص نظام کے ماتحت ہوتی ہے اور اس میں مختلف ضروریات کی تکمیل مدنظر ہوا کرتی ہے تو یہ تقسیم عمل اجتماعی نقطہ نظر سے اشتراک عمل ہے۔ ہر فرد اور قوم بیک وقت انفرادی تحفظ اور بقا کے لئے دوسرے افراد اور قوم سے برسر جنگ بھی ہے۔ اور نظام اجتماعی میں منسلک ہونے کی بنا پر باہمی ارتباط، اشتراک اور تعاون پر بھی مجبور ہے۔

افراد و اقوام کا عروج وزوال

جس طرح افراد کی عمر کے مختلف دور ہوتے ہیں اسی طرح قوموں کی عمریں بھی باعتبار عروج وزوال کے مختلف ہیں۔ ہر فرد اپنے جسمانی نظام کے لحاظ سے مختلف دور طے کرتا ہے اور اس کا آخری دور، دور انحطاط کہلاتا ہے۔ اس دور کو طے کرنے کے بعد اگرچہ وہ شخصی طور پر فنا ہو جاتا ہے مگر اس کی نسل کا سلسلہ اس کی اکثر خصوصیات کو زندہ رکھنے میں اس کا قائم مقام ہو تا ہے۔ قوموں کے عروج وزوال کی بھی یہی صورت ہے۔ قومیں بننے کے بعد بگڑتی ہیں اور اپنے انحطاط کے آخری دور میں پہنچنے کے بعد یا تو فنا ہو جاتی ہیں یا پھر انہیں زندگی کے آثار رونما ہونے لگتے ہیں۔ فنا ہونے کا یہ مطلب ہے کہ ان میں قومی روح نہیں باقی رہتی بلکہ وہ دوسری قوموں میں یا تو منضم ہو کر اپنی قومیت کو فنا کر دیتی ہیں اور یا پستی اور انحطاط کا دور ان کا ممتد اور طویل ہو جاتا ہے، جو قومیں تنزل کے بعد ترقی کرتی ہیں، ان میں قومی زندگی کے تمام اسباب یکے بعد دیگرے پھر عود کر آتے ہیں۔ غرض کہ قوموں کی موت ایسی موت نہیں ہے جس کے بعد وہ زندہ نہ ہو سکیں بلکہ ان کے زندہ ہونے کا امکان رہتا ہے۔

عروج وزوال کے اسباب

ہر فرد اور قوم اپنے اسلاف اور آیندہ نسلوں کے درمیان ایک ایسا حلقۂ اتصال یا نقطۂ اتحاد ہے جس کے ذریعہ سے اسلاف کے عادات اطوار، فطری میلانات، تربیت و تعلیم کے طور طریقے، جسمانی اور دماغی قوٰی کی خاص ہیئت قومی اور خاندانی جذبات، رسم ورواج، قوانین فطرت کی پابندی یا خلاف ورزی کے اثرات وغیرہ آنے والی نسلوں تک پہنچتے ہیں۔ اس سلسلہ کی ہر کڑی اپنے اسلاف سے جو کچھ حاصل کرتی ہے۔ اس پر اپنے نظام شخصی یا نظام اجتماعی کی ابتری یا عمدگی کے نتائج اور اپنے ماحول سے اخذ کردہ اچھے یا برے عادات کے اثرات کا اضافہ کر کے دانستہ یا نادانستہ طور پر اپنے بعد والوں کے حوالہ کر دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس طرح افراد اور خاندانوں کے امتزاج سے جسمانی قوٰی کی ساخت اور ترکیب میں معلوم طریقہ سے تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح اخلاق و عادات کے امتزاج و اختلاط سے تربیت و تعلیم کے طریقوں اور ان کے اثرات میں نسلی اور اجتماعی نظام کے ماتحت غیر محسوس تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ یہ تبدیلی اگر رو بہ تنزل ہو تو قوموں کی پستی اور زوال کا اور اگر رو بہ ترقی ہو تو عروج کا سبب ہوتی ہے۔

تنازع للبقاء

کائنات عالم کی گوناگوں اور بوقلمون [illegible] و مخترعات، مبدع کائنات کی صنعت ابداع کا مظہر یا عکس ہیں، علوم و فنون کی ترقی، سائنس کے کرشمے مادیات میں تصرف، اختراعات و ایجادات اور اس میں اقوام عالم کی سابقت و منافست، مبدع کائنات کے صنعت ابداع ہی کے نتائج ہیں۔ ان نتائج کی طرف یک لخت یا بلا امتیاز چشم پوشی اور غفلت اور دنیا کی مادی ترقی کی تحقیر یا نفرت ایک طرف اگر قوانین فطرت سے روگردانی ہے تو دوسری طرف خود مبدع کائنات کی [illegible] صرف بھی نہیں بلکہ [illegible]

حیات میں پسپائی، دائمی محکومی، غلامی، بے بسی اور ذلت کے عذاب کا مستحق بننے کی تیاری ہے۔

دنیا کا ہر نظام خواہ وہ روحانی ہو یا اخلاقی، شخصی ہو یا قومی، انفرادی ہو یا اجتماعی، ادبی ہو یا فنی، علمی ہو یا عملی، تبلیغی ہو یا تعلیمی بدون مادی قوتوں کی تکمیل و تنظیم کے برقرار نہیں رہ سکتا۔ اور کوئی مادی قوت مکمل و منظم نہیں سمجھی جا سکتی تاوقتیکہ دنیا کی منظم قوتوں کی مدافعت و مقاومت کے لئے جدید ترین آلات مدافعت سے آراستہ نہ ہو اور ہر لمحہ ان کی قوتوں میں توازن قائم رکھنے کے لئے ان کی تجدید نہ ہوتی رہے۔

مقاومت کیلئے مسابقت لازمی ہے

افراد اور اقوام میں اپنے تحفظ اور بقا کے لئے جدید منافست و مسابقت کا پایا جانا ضروری ہے۔ یہ جذبہ رقابت ایک فطری میلان ہے جو ہر فرد کو دوسرے فرد سے اور قوم کو دوسری قوم سے آگے بڑھنے پر ابھارتا رہتا ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ جو قومیں معرکہ حیات کی کشمکش میں ثابت قدم رہنے کی قوت اور صلاحیت زیادہ رکھتی ہیں۔ وہی اس میدان مسابقت میں بازی بھی لیجاتی ہیں۔ معرکہ حیات میں ثابت قدم رہنے کے لئے جن آلات حرب سے آراستہ ہونے کی ضرورت ہے وہ ہر زمانہ کی متصادم قوتوں اور متغلب قوموں کی قوت اور مدافعت اور جذبہ مقاومت کی کمی و بیشی کے اعتبار سے مختلف رہے ہیں اور رہیں گے۔ آلات حرب سے مراد ہر وہ قوت ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں سپر کا کام بھی دے۔ اور قوموں کی علمی، فنی، تمدنی، خصامتی اور اجتماعی دور میں ہر قوم کو دوسری قوموں سے سبقت لے جانے میں بھی مدد دے۔

مذاکرہ

ہمارے علماء کے فقہی اختلافات

(۴)

چوتھی صدی کے پہلے اور بعد کے حالات و خصوصیات

یہ سب کچھ تھا۔ فقہ کے مختلف مذاہب قائم ہو چکے تھے، لیکن چوتھی صدی سے قبل تک وہ تمام فتنے ظہور میں نہیں آئے تھے جن سے آج ہر گھر کا تنور گرم ہے۔ علما اور عوام دونوں کا طریقہ آج سے بالکل مختلف تھا، آج ہر مسلمان بچہ ماں کے پیٹ سے حنفی یا شافعی اور مقلد یا غیر مقلد پیدا ہوتا ہے، اور ان میں سے کسی نہ کسی طریق و مسلک کی حمایت کیلئے اپنے اندر مجنونانہ عصبیت رکھتا ہے، لیکن اس عہد میں یہ بات نہ تھی۔ عوام کو ان مذاہب و طرق سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اور اس عہد کی مسجدیں ہمارے زمانہ کی مظلوم مسجدوں کی طرح مقلد و غیر مقلد کی معرکہ آرائیوں اور تکفیر و تفسیق کی گرم بازاریوں سے آلودہ نہیں تھیں۔ عوام اپنی دینی ضروریات میں اپنے شہر کے ہر متقی عالم سے رجوع کرتے تھے۔ ان کو اس سے بحث نہیں ہوتی تھی کہ وہ فقہ کے مختلف مذاہب میں سے کس مذہب کا عالم ہے اور اس کے فتوؤں اور رایوں پر بغیر کسی خدشہ کے اطمینان کرتے تھے۔ لیکن آج یہ حال ہے کہ ہر جماعت کے الگ الگ علما، اور الگ الگ مفتی ہیں۔ اور ممکن نہیں کہ ایک مقلد غیر مقلد سے

یا غیر مقلد سے فتویٰ پوچھ کر اپنے دین پر قائم رہ سکے یہاں تک کہ مسجدوں میں ان میں سے ایک کے پیچھے دوسرے کی نماز بھی درست نہیں ہوتی۔ پہلی اور دوسری صدی کے متعلق صاحب قوت القلوب ابو طالب مکی کی شہادت یہ ہے جو ہم شاہ صاحب کے واسطے سے نقل کرتے ہیں۔

"یہ کتابیں اور مجموعے سب بعد کی چیزیں ہیں، اشخاص کی قال و قیل کا اہتمام کسی ایک متعین مذہب پر فتویٰ دینا، ہر بات میں کسی ایک ہی شخص کے قول کی نقل و حکایت اور اسی کے مذہب و مسلک پر اعتماد، پہلی اور دوسری صدی کے لوگ ان باتوں سے آشنا نہ تھے۔"

پھر خود شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

"بلکہ اس زمانہ میں دو قسم کے لوگ تھے۔ علما اور عوام۔ عوام کا حال یہ تھا کہ وہ تمام متفق علیہ مسائل میں جن میں مسلمانوں میں یا کم از کم جمہور مجتہدین میں اختلاف نہ تھا، بلا واسطہ صاحب شرع کی تقلید کرتے تھے اور غسل، وضو، نماز اور زکوٰۃ کے تمام احکام و آداب اپنے گھر کے بزرگوں اور شہر کے معلموں سے سیکھتے اور اس پر عمل کرتے تھے اور جب کوئی خاص صورت پیش آتی تو بغیر کسی تعیین مسلک و مذہب کے جس مفتی و فقیہ سے بھی ممکن ہوتا فتویٰ پوچھ لیتے۔"

اپنے اس دعویٰ پر ابن ہمام کی مندرجہ ذیل تائید بھی نقل کی ہے۔

"کبھی ایک سے پوچھتے کبھی دوسرے سے۔ کسی متعین مفتی کے پابند نہ تھے۔"

علما کا حال بھی آج کے علما سے بالکل مختلف تھا۔ اس عہد میں یا تو ایسے لوگ تھے جو مجتہد مطلق کی شان رکھتے تھے کہ دین کے معاملہ میں جو کچھ کہتے خود اپنے علم و بصیرت کی کسوٹی پر جانچ پرکھ کر کہتے۔ یہ نہیں تھا کہ اگلوں نے جو کچھ کہہ دیا ہو اس کو آنکھ بند کر کے قبول کر لیں اور جب ضرورت پیش آئے بے جھجک اس کو نقل کر دیں۔ قاضی ابو یوسف اور امام محمدؒ

دونوں حضرات امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں لیکن یہ نہیں ہے کہ وہ امام صاحبؒ کے اجتہادات سے اختلاف نہ کرتے ہوں، ان حضرات کے اختلافات کا حال تو یہ ہے کہ اگر وہ سب جمع کئے جائیں تو امام صاحب کی فقہ سے ان کی فقہ بالکل الگ مرتب کی جا سکتی ہے۔ لیکن چونکہ ان کے اجتہادات کے بنیادی اصول وہی ہیں جو امام صاحب نے قائم فرمائے تھے اس لئے یہ فقہ حنفی کے اساطین و عمائد میں گنے گئے اور آج تک ان کو حنفیت سے خارج کرنے کی جرأت کسی نے نہیں کی۔

دوسری قسم کے وہ علما تھے جو اجتہاد کے شرائط و آداب پوری طرح اپنے اندر جمع نہیں کر سکے۔ بلکہ بیشتر کسی خاص امام کے مسائل و اجتہادات کو اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ لیکن اس پیش نظر رکھنے کی صورت وہ نہیں تھی جو آج ہم دیکھتے ہیں کہ چند مخصوص کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے بغیر کسی بحث و حجت کے مجموعہ وحی و الہام بن گیا ہے بلکہ وہ ان مسائل کو اپنے فکر و نظر کی کسوٹی پر جانچتے پرکھتے تھے۔ ان کو تفصیلی دلائل کی روشنی میں سمجھتے تھے اور پھر اس میں قوی و ضعیف میں فرق کر کے قوی کو ترجیح دیتے تھے اور ضعیف کو مرجوح قرار دیتے تھے اور بسا اوقات اپنے ائمہ کے اقوال و مذاہب پر استدراک بھی کرتے تھے اور خود اپنا اجتہاد پیش کرتے تھے لیکن ان باتوں کے باوجود وہ نہ تو اس امام کی تبعیت سے خارج سمجھے جاتے تھے نہ ان کے دین میں کوئی فتور واقع ہوتا تھا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"رہے خواص تو ان میں سے اہل حدیث کا حال یہ تھا کہ وہ صرف رسول اللہ کی احادیث اور صحابہؓ کے آثار میں مشغول رہتے تھے .... اور اگر نقل کے تعارض یا جانب ترجیح کے خفا کی وجہ سے کسی مسئلہ میں کوئی قابل اطمینان بات نہ ملتی تو فقہا میں سے کسی کا مسلک اختیار کر لیتے تھے اور اگر اس بارہ میں فقہا میں اختلاف ہوتا تو جو بات

زیادہ مضبوط ہوتی اس کو اختیار کرتے خواہ اہل مدینہ کی طرف منسوب ہو یا اہل کوفہ کی طرف"

.... اہل تخریج کا حال یہ تھا کہ جس مسئلہ میں کوئی واضح بات نہ ملتی، تخریج کرتے اور اپنے مذہب کے اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کرتے اور یہ لوگ اپنے اصحاب کے مذہب کی طرف منسوب کئے جاتے کہ فلاں شافعیؒ ہے اور فلاں حنفی ہے اور اصحاب حدیث میں کچھ بھی جو لوگ مذاہب فقہ میں سے کسی مذہب سے زیادہ موافقت کرتے وہ بسا اوقات اسی مذہب کی طرف منسوب کردیئے جاتے مثلاً نسائی اور بیہقی امام شافعیؒ کی طرف منسوب ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں نرے مقلد کے لئے، افتا و قضا کے شعبہ میں مطلق گنجائش نہیں تھی۔ اس فرض کو یا تو وہ لوگ انجام دیتے جو مجتہد مطلق کا رتبہ رکھتے یا کم از کم وہ لوگ جو مجتہد فی المذہب کا۔ اس سے کم رتبہ کے اشخاص کو یہ حق نہیں تھا کہ دین کے معاملہ میں زبان کھولیں اور فتویٰ اور قضا کے منصب کے آرزومند ہوں۔ پس قدرتی طور پر اس زمانہ کے علماء دین و شریعت کے خادم تھے اور موجودہ زمانہ کی طرح ان کی حیثیت نہیں ہوئی تھی کہ متعین اماموں کے ایجنٹ بن کر ایک طرف قانون الٰہی کی حاکمیت اور دین کی وحدت کو پارہ پارہ کردیں اور دوسری طرف امت کے شیرازہ کو درہم برہم۔ لیکن آہستہ آہستہ بالآخر حالات نے یہی صورت اختیار کرلی اور ان علماء کی جگہ ایسے علماء و فقہا پیدا ہوگئے جنھوں نے مذہبی پیشوائی اور دنیوی سیادت کے لالچ میں جدل و اختلاف کو فن کی طرح مرتب کردیا اور آہستہ آہستہ علماء اور عوام سب الگ الگ ٹولیوں میں بٹ گئے۔ وکل حزب بما لدیھم فرحون۔

شاہ صاحب اس حالت کو امام غزالی رحمۃ اللہ کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں:-

"پھر ان صدیوں کے گذرنے کے بعد ایسے لوگ آئے جنھوں نے یمین و یسار کی مختلف راہیں اختیار کرلیں اور علم فقہ سے متعلق ان میں جدل و اختلاف کا ایک بازار گرم ہوگیا۔ امام غزالیؒ کے لفظوں میں اس کی تفصیل یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے انقراض کے بعد منصب خلافت کی باگ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آئی جنھوں نے اس کو بغیر کسی استحقاق کے پایا تھا اور فتویٰ اور احکام دین سے جن کو کوئی مس نہ تھا۔ یہ مجبور ہوئے کہ فرائض کی انجام دہی میں فقہاء سے مدد لیں اور ہر معاملہ میں ان کو ساتھ رکھیں۔ لیکن زمانہ وہ تھا کہ ابھی علما کی ایک جماعت اپنے پچھلے رنگ پر باقی تھی اور ان میں جہل اور دنیا طلبی کی برائیاں نہیں پیدا ہوئی تھیں۔ ان لوگوں سے جب سرکاری خدمات قبول کرنے کی خواہش کی جاتی تو یہ لوگ اعراض کرتے۔ لوگوں نے حکام کی طرف سے علما کی اس عزت افزائی کو باوجود ان کے اس اعراض کو دیکھا تو ان کو حصول عزت و جاہ کی یہ سب سے زیادہ کامیاب راہ نظر آئی اور پورے جوش و خروش کے ساتھ حصول علم دین کی طرف لپکے نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے دنوں کے اندر وہی فقہا جو طالب و محبوب تھے آستانہ حکومت کے سائل و طالب بن کے رہ گئے۔ اور سلاطین سے استغنا اور علیحدگی کی وجہ سے یا تو معزز اور سربلند تھے یا پھر ان کی دربارداری اور خوشامد کی وجہ سے بے حیثیت اور ذلیل ہوگئے۔ اس سے پہلے ہی سے کلامی تصنیفات کا آغاز ہوچکا تھا۔ جن میں قیل و قال اور ایراد و جواب کے تمام فتنے موجود تھے۔ اور یہ اتفاق تھا کہ بہت سے امراء و سلاطین فقہی مناظروں کی گرم بازاری کے بڑے دلدادہ تھے۔ ان باتوں نے طالب دنیا فقیہوں کو ان کتابوں کی طرف متوجہ کیا .... اور یہ امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے اختلافی مسائل میں الجھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ

دقائق شریعت کے استنباط اور اصول فن کی تحقیق و تنقید میں مصروف ہیں۔ بالآخر اختلافی اور مجادلانہ کتابوں کا انھوں نے انبار لگا دیا اور ابتک اسی راہ میں سرگرم کار ہیں اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ آگے کیا کیا فتنے ظہور میں آنے والے ہیں۔"

فقہا کی اس جنگ وجدل سے قدرۃً تقلید جامد کے فتنہ نے جنم لیا، شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

" اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بالکل غیر شعوری طور پر تقلید ان لوگوں کے دلوں میں رچ بس گئی کیونکہ فقہا کے آپس کے جنگ وجدل سے صورت یہ ہوگئی کہ اگر ایک شخص ایک فتوی دیتا تو دوسرا اس کی تردید کی کوشش کرتا۔ اس رد و اختلاف کے معرکہ کا فیصلہ صرف اس طرح ہوتا کہ اس بارہ میں متقدمین میں سے کسی کا قول پیش کیا جائے۔"

ان فقہا کی جنگ وجدل نے جو خوفناک نتائج پیدا کئے گو وہ ہم میں سے ہر شخص کے سامنے ہیں لیکن اس کے متعلق خود شاہ صاحب کے تاثرات نہایت عمیق ہیں، اس لئے ہم رسالہ انصاف سے خود انہی کے الفاظ پیش کرنا چاہتے ہیں گو افسوس ہے کہ ان کے پرزور قلم کی ترجمانی اردو میں کسی طرح ممکن نہیں لیکن فی الجملہ ان کے تاثرات کا اندازہ ہو سکے گا۔ وہ فرماتے ہیں۔

" پس ان میں سے کچھ ایسے ہوئے جنھوں نے اصول فقہ کو قیل و قال کا اکھاڑا بنایا اور اپنے ہم مشربوں کے لئے جدل و مناظرہ کے اصول و قواعد مرتب کئے اور اس میں رد و جواب، اثبات و تردید، تعریف و تقسیم اور اختصار و اطناب کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ کچھ ایسے ہوئے جنھوں نے اس پر مزید اضافہ کیا کہ ایسی مستبعد اور ناممکن الوقوع صورتیں گھڑ گھڑ کے مسئلے وضع کئے کہ ایک عاقل ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور مخرجین کے کلام سے ایسے ایسے عموم اور اشارے پیدا کئے کہ جنکا سننا نہ ایک عالم

گوارا کرے گا نہ ایک جاہل۔ جدل و اختلاف اور تعمق کا یہ فتنہ، فتنہ اولیٰ سے مشابہ ہے جب لوگ ملک و سلطنت کے لئے لڑتے تھے۔ اس فتنہ کا نتیجہ ملک عضوض کا ظہور اور اندھی بہری لڑائیوں کا وقوع تھا۔ اسی طرح اس فتنہ کا نتیجہ ایسے جہل و اختلاط اور شکوک و اوہام کا غلبہ اور تسلط ہے کہ جس سے نجات کی کوئی توقع نہیں۔ اس فتنہ کے بطن سے ایسی نسلوں نے جنم لیا جن کی پرورش تقلید جامد کی غذا سے ہوئی ہے اور جن کو حق و باطل میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ آج فقیہ اس یاوہ گو کو کہتے ہیں جس نے فقہا کے اقوال بغیر کسی تمیز و معرفت کے رٹ لئے ہوں اور اپنے حلق کے زور سے ان کو دہرا سکتا ہو۔ اور محدث وہ کہلاتا ہے جو بغیر فرق صحیح و سقیم کچھ حدیثیں اپنے جبڑوں کے زور سے افسانہ گویوں کی طرح سنا سکتا ہو۔"

اسی حالت کا دردناک نقشہ شیخ عز الدین بن عبدالسلام نے کھینچا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

" انتہائی تعجب انگیز بات تو یہ ہے کہ بعض فقہائے مقلدین بعض مرتبہ اپنے اماموں کے ضعف ماخذ سے واقف ہوتے ہیں اور اس کو وہ کسی طرح دفع کرنے پر قادر نہیں ہوتے لیکن اس کے باوجود وہ اس مسئلہ میں انہی کی پیروی کرتے ہیں اور جو شخص اپنے مذہب کی تائید میں کتاب و سنت اور قیاس صحیح پیش کرتا ہے بسبب جمود اس کی بات نہیں مانتے بلکہ ظاہر کتاب و سنت سے بچنے کے لئے طرح طرح کے حیلے اور قسم قسم کی دُور از کار تاویلیں سوچتے ہیں کہ کسی طرح ان کے پیشوا پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔"

پھر فرماتے ہیں:۔

" ان مروجہ مذاہب اور ان کے مقلد حامیوں کے ظہور سے پہلے لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ بغیر کسی امتیاز مسلک و مشرب کے علما سے فتوے پوچھ لیتے تھے۔ لیکن

"ان مقلدوں کا طریق یہ ہے کہ وہ اپنے متعین امام ہی کی پیروی کریں گے خواہ اسکا مسلک دلائل سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو۔ گویا وہ خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر ہے جس کی پیروی ہر حال میں لازم ہے۔ حالانکہ یہ طریقہ حق سے بالکل منحرف ہے اور کوئی عاقل اس کو پسند نہیں کر سکتا۔"

ہمارے ان متاخرین فقہا نے تقلید وجمود کا یہ زور ان مقدس ائمہ کی حمایت میں دکھایا جن میں سے ہر ایک نے خود اس بت کو نہایت بھاری گرز سے مجروح کیا تھا۔

حضرت امام مالکؒ کی نسبت روایت ہے کہ جب خلیفہ منصور حج کے لئے گیا تو اس نے امام مالک سے کہا کہ آپ نے جو کتاب (موطا) مرتب فرمائی ہے میں چاہتا ہوں کہ اسکی نقلیں لے کر اس کا ایک ایک نسخہ تمام بلاد اسلام میں بھجوادوں اور حکم دیدوں کہ اس کتاب کے علاوہ اور کسی کتاب پر عمل نہ کیا جائے۔ امام مالک نے جواب دیا کہ اے امیر المومنین ایسا نہ کیجئے۔ لوگوں کے پاس بہت سے اقوال و آثار پہنچ چکے ہیں اور جو چیزیں لوگوں کو پہلے سے مل چکی ہیں ان کو انھوں نے اپنا علم وعمل بنالیا ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ لوگوں کو ان کے مسلک و مشرب پر چھوڑ دیجئے۔ اس معاملہ میں کوئی مداخلت نہ کیجئے۔

یہی قصہ کسی قدر اختلاف کے ساتھ ہارون الرشید کی طرف منسوب ہے کہ اس نے امام مالک سے مشورہ کیا کہ آپ اجازت دیں تو موطا کو خانہ کعبہ میں آویزاں کردوں اور حکم دیدوں کہ تمام ممالک اسلام میں یہی کتاب بنائے افتا و قضا قرار پائے۔ لیکن امام مالک نے فرمایا کہ امیر المومنین ایسا نہ کیجئے۔ رسول اللہؐ کے صحابہ فروع میں مختلف الرائے تھے اور وہ تمام ممالک اسلام میں پہنچے اور ان کا طریقہ شائع ہوچکا ہے۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت امام مالک مختلف مسالک و مذاہب کو

کس نظر سے دیکھتے تھے۔ یقیناً امام مالک سے بڑھ کر اس بات کے لئے دردمند کوئی نہیں ہوسکتا کہ مسلمان کسی غلط راستہ کو اختیار نہ کریں۔ پس اگر اپنے طریق و مسلک کے علاوہ دوسروں کے طریق و مسلک کو وہ اس نگاہ سے دیکھتے جس نگاہ سے آج کے علماء دیکھتے ہیں تو وہ... ہارون الرشید کی خواہش میں مانع نہ ہوتے۔ بلکہ جس دن اس نے ان کے سامنے اپنی خواہش پیش کی تھی اس دن سے بڑھکر وہ اپنی اور اپنے مذہب کی خوش قسمتی اور بلند اقبالی کا کوئی اور دن نہ سمجھتے۔

یہی امام مالک فرماتے ہیں کہ

ما من احد الا هو ماخوذ من	رسول اللہ کے سوا کوئی نہیں جسکے کلام میں قابل اخذ
كلامه ومردود عليه الا رسول الله	اور قابل ترک دونوں قسم کی باتیں نہ ہوں۔

حضرت امام ابو حنیفہ کے متعلق الیواقیت والجواہر میں ہے۔

لا ينبغي لمن لم يعرف دليلي	جو شخص میری دلیل سے واقف نہ ہو وہ
ان يفتي بكلامي	میرے قول پر فتوی نہ دے۔

قاضی ابو یوسف اور امام زفر وغیرہ فرمایا کرتے تھے۔

لا يحل لاحد ان يفتي بقولنا	کسی کیلئے جائز نہیں کہ وہ ہمارے قول پر فتوی دے
ما لم يعلم من اين قلنا	جبتک اسے یہ نہ معلوم ہو کہ ہم نے یہ بات کہاں سے کہی ہے۔

عصام بن یوسف سے پوچھا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ امام ابو حنیفہؒ سے اکثر مسائل میں اختلاف فرماتے ہیں۔ جواب دیا کہ امام صاحب کو اللہ تعالیٰ نے علم و فہم میں سے وہ حصہ عطا فرمایا تھا جو ہم کو نہیں ملا ہے۔ اس لئے وہ ایسی باتوں تک پہنچ جاتے تھے جن تک ہم نہیں پہنچے اور یہ ہمارے لئے ممکن نہیں کہ ہم ان کے کسی قول پر بے سمجھے بوجھے فتوی دیدیں۔

حضرت امام شافعی کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے نہ تو اپنی تقلید کی اجازت دی ہے نہ دوسروں کی۔ مزنی نے اپنے مختصر کے شروع میں اس کا نہایت تصریح کیساتھ حوالہ دیا ہے۔ پھر انہی کا ارشاد ہے کہ

مهما قلت من قول او اصلت	میں جو بات بھی کہوں اور جو اصل بھی قائم کروں
من اصل فبلغ عن رسول الله	جب اس کے خلاف کوئی بات رسول اللہ
خلاف ما قلت فالقول ما	سے مل جائے تو پھر حضور ہی کی بات اصل
قاله صلى الله عليه وسلم	ہے۔

امام احمد رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔

ليس لاحد مع الله ورسوله كلام	اللہ اور رسول کی بات ہوتے ہوئے کسی کیلئے محل سخن نہیں۔

جو فیاضی، وسعت اور رواداری ان بزرگوں کے اقوال میں ہے اس سے زیادہ یہ چیزیں ان کے اعمال میں تھیں۔ آج کتنے حنفی اور اہل حدیث ہیں جو ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھنا جائز نہیں سمجھتے لیکن ان اکابر کا طرز عمل اس سے مختلف تھا۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے اصحاب برابر مدینہ کے مالکی ائمہ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے حالانکہ یہ لوگ بسم اللہ نہ تو سراً پڑھتے تھے نہ جہراً۔ رشید نے امام مالک کے فتویٰ پر فصد کے بعد وضو کئے بغیر نماز پڑھائی، قاضی ابو یوسف نے اس کے پیچھے نماز پڑھی اور دہرائی نہیں۔ امام احمد بن حنبل رعاف اور حجامت کی صورت میں وضو کے قائل تھے۔ ان سے سوال کیا گیا کہ اگر امام کے جسم سے خون نکل آئے اور وہ وضو نہ کرے تو کیا آپ اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ فرمایا، بھلا امام مالک اور سعید بن مسیب جیسے لوگوں کے پیچھے نماز پڑھنے سے کیسے انکار کر سکتا ہوں۔ قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے متعلق روایت ہے

کہ یہ لوگ عیدین میں تکبیر ابن عباس کے مذہب کے مطابق کہتے تھے اس لئے کہ ہارون الرشید کو اپنے جد امجد کی تکبیر زیادہ پسند تھی۔ امام شافعیؒ رحمہ اللہ نے صبح کی نماز امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مقبرہ کے قریب پڑھی اور امام کے احترام میں دعائے قنوت نہیں پڑھی اور فرمایا کہ ہم کبھی کبھی اہل عراق کے مذہب کو بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کے متعلق روایت ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے حمام میں غسل کر کے جمعہ کی نماز پڑھائی۔ جب لوگ متفرق ہو چکے تو معلوم ہوا کہ حمام کے کنوئیں میں چوہیا مری ہے۔ ان سے اس کا ذکر کیا گیا تو فرمایا کہ کچھ مضائقہ نہیں آج ہمارا عمل اہل مدینہ کے مذہب پر ہوگا۔ اذا بلغ الماء قلتين لم يحمل خبثا۔

جن لوگوں نے اپنے قول اور عمل سے یہ عمدہ سبق دیئے آج انہی کے ماننے والوں کی جنگ و جدل کی اطلاعات ہندوستان کے ہر گوشے سے مل رہی ہیں اور اس حالت نے لوگوں کو اس قدر مایوس اور دل شکستہ کر دیا ہے کہ جب کبھی اس مسئلہ پر غور ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کوئی شرعی نظام تجویز کیا جائے تو بہتوں کو تو یہ احمقانہ خبط معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مذہبی اختلافات کے اندر اس کا امکان نہیں اور بہتیرے ایسے ہیں جن کو طرح طرح کے اندیشے لاحق ہو جاتے ہیں کہ مبادا یہ کوئی ایسی سازش ہو جس کا مقصود ان مسلمان فرق کے مذاہب کو دبانا ہو جو ہندوستان میں اقلیت کے اندر ہیں۔

افکار جدیدہ

"بدن کا شیطان"

از جناب مولوی عزیز الرحمن صاحب اصلاحی

یہ فرانسیسی ماہر نفسیات ریمون کورٹوا کی ایک دلچسپ کتاب کا نام ہے۔ اسمیں اس نے جسم انسانی کی جنسی خواہشات کی تحلیل کی ہے اور ریاضت نفس و تہذیب اخلاق کے طریقے بتائے ہیں۔

اس کا خیال ہے کہ انسانی خون اور اعصاب کے اندر جنسی خواہشات کا ہیجان اسی وقت ہوتا ہے جب انسان کا ذہن ہر طرح کے افکار سے خالی اور مختلف قسم کے حسی موثرات کیلئے کھلا رہتا ہے۔ جو شخص کسی کام میں پورے انہماک کے ساتھ مشغول ہو اور اس کا سارا وقت اور ذہن و فکر کی تمام قوتیں کسی دھن میں ہوں، اس پر نسوانی چرتر کارگر نہیں ہو سکتا۔ البتہ جو شخص بے مشغلہ آرام طلب اور عشرت پسند ہوتا ہے، اس کی عقل و فہم پر نسوانی جادو آسانی سے چل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ آرام کے طالب ہوتے ہیں اور اپنے عقلی دوران کو روک کر، ذہن کو دوسرے قسم کے شیریں خیالات اور میٹھی نیند کی طرف مائل کر دیتے ہیں تو آپ کے بدن کا شیطان اس موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے اور آپ کی عقل و فکر پر غالب آکر آپ سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا ہے۔

نفس انسانی کے اندر جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، ان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز تبدیلی یہ ہے کہ انسان کسی عملی مشقت پر اسوقت تک تیار نہیں ہوتا جب تک کہ اس کو عیش و عشرت اور عورت کے واسطے سے نفسانی خواہشات کی تکمیل کا خیال پریشان نہیں کر دیتا ہے۔ اس لحاظ سے نفسانی اغراض، جنسی خواہشات، عقلی راحت اور فکری آسائش دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسی بنا پر مصنف کتاب نے شہوانی ہیجان کے علاج کے لئے صرف فکری طریقہ تجویز کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فکر ہمیشہ شہوت کو دبا سکتی اور روکتی ہے۔ پس جب تک کہ آدمی شہوات سے بالکل مغلوب نہ ہو جائے اسکا فرض ہے کہ نفس کی تربیت و اصلاح فکر ہی کے واسطے سے کرے۔ یعنی شہوانی صورتوں سے عقلی صورتوں کی طرف رجوع کرے اور اس رجعت کے اندر جو حلاوت ہے اسکو جاننے کی کوشش کرے۔

جب یہ مرحلہ طے ہو جائے گا تو شہوانی خیال فکر و نظر کا سرچشمہ بن جائے گا۔ اور اس وقت آدمی شہوانی ہیجانات کی چیرہ دستیوں سے بالکل مامون ہو جائے گا۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ ایک میدان سے دوسرے میدان، ایک خیال سے دوسرے خیال اور ایک عقلی شاہراہ سے دوسری عقلی شاہراہ کی طرف سرعت کے ساتھ منتقل ہو جانا کچھ آسان نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم اس مشق سے بالکل بے پروا ہو جائینگے اور شہوانی خیالات کو چھوڑ دیں گے کہ وہ ہماری تخیلہ اور فکر پر جب چاہیں تاخت کرتے رہیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے قلب و دماغ اسی قسم کے فاسد خیالات کے اڈے بن جائیں گے۔ اور پھر ان کے قبضہ کا توڑنا ناممکن ہو جائے گا۔ اور پھر ان کی صحبت سے متاثر ہو کر ہمارے دوسرے صالح خیالات بھی انہی کا رنگ اپنے اندر جذب کریں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر ... شہوانی خیالات کی تربیت و اصلاح کی جائے تو بآسانی اس "جن" کو مسخر کر کے اس سے نہایت مفید اصلاحی اور تعمیری کام لئے جا سکتے ہیں ورنہ جب یہ پورا پورا قابو دل و دماغ پر پالیتا ہے تو پھر انسان کا ہر ارادہ اور ہر عمل اسی کے اشارہ کے مطابق ہوتا ہے اور اس کے فکر و خیال کے ریشہ ریشہ کے اندر یہی شیطانی روح پہنچ بس جاتی ہے۔

افسوس ہے کہ ان فاضل پروفیسر کے سامنے قرآن مجید کی یہ آیت نہیں تھی و من یعش عن ذکر الرحمان نقیض له شیطانا فهو له قرین (جو شخص ذکر الہی سے آنکھیں بند کر لیتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں پس وہی اس کا ساتھی ہوتا ہے۔)

عبقریت اور اخلاق

عبقری کی عبقریت خود اس کے اندر کی کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ فطرت کا عطیہ ہے۔ مگر باوجود اس کے عبقریت بذات خود، غیر فانی کارناموں کا باعث نہیں ہوتی، بلکہ انکی بنیادیں ٹھوس اور اعلیٰ اخلاق ہی سے استوار ہوتی ہیں۔ ہنگرین ادیب فرانک رالف نے اپنی کتاب "کلید عظمت" میں اس حقیقت پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ ذیل میں اس کا خلاصہ ہدیہ قارئین ہے۔

فرانک رالف کا خیال ہے کہ عبقری کی عبقریت اور اس کے اخلاق کے درمیان ایک دائمی کشمکش رہتی ہے۔ عبقریت چاہتی ہے کہ وہ بلند و برتر ہو کے رہے اور بڑے بڑے کارناموں کی تکمیل کا فخر حاصل کرے۔ لیکن عبقری کے اخلاق اس کی خواہشات اور اسکے فطری میلانات، عبقریت کی اس جد و جہد میں سد راہ ہوتے ہیں۔ اگر عبقری کے اخلاق و

میلانات کمزور و فاسد ہوتے ہیں تو اس کے ارادہ و استقلال اور اس کی عزیمت و سرگرمی کو نقصان پہنچتا ہے اور اس کی عبقریت خود بخود کمزور ہو کر دب جاتی ہے۔ اور عبقریت کے تمام اغراض و مقاصد بے کار خوابوں اور کبھی نہ پوری ہونے والی خنک امیدوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

عبقری کی عظمت کے دو زینے ہیں۔ پہلا زینہ یہ ہے کہ وہ اپنی عبقریت کے ذریعہ کمال کی منزلیں طے کرنے کی کوشش کرے۔ دوسرا زینہ یہ ہے کہ عبقریت کے منشاء کو پورا کرنے کے لئے زبردست اخلاقی جد و جہد سے کام لے:

مشہور ناول نویس بزاک کو جب یہ محسوس ہوتا کہ فکری نتائج کی چنگاریاں اس کے ذہن میں بڑی تیزی سے بھڑک رہی ہیں تو معاً اس کو یہ بھی خیال ہوتا کہ وہ چند مہینوں کیلئے تمام دنیاوی لذتوں اور ہنگاموں سے کنارہ کش ہو کے کہیں گوشہ گیر ہو جائے کہ تنہائی میں یہ خیالات اچھی طرح پختہ ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ کوئی کمزور طبیعت و اخلاق کا آدمی ہوتا اور دنیاوی لذتوں اور راحتوں کے پھندوں سے وہ ایسے مواقع پر اپنے کو نہ چھڑا سکتا تو اس طرح کی کتنی بہاریں آتیں اور گذر جاتیں مگر اس کے دامن فکر کو ایک پھول بھی نصیب نہ ہوتا۔

پس عبقری کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی عبقریت پر بھروسہ کرے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اس عبقریت کے کامل ظہور کے لئے اپنے اندر ایک زبردست اخلاقی قوت رکھے ورنہ اس کی عبقریت کی مثال اس بیج کی ہوگی جو خود تو بہت صالح اور تندرست ہے مگر نہ تو اس کے لئے زمین سازگار ہے اور نہ آب و ہوا کی موافقت موجود ہے۔

بخل و حرص

بخل اور حریص میں کیا فرق ہے؟ کیا حرص بھی بخالت کا سبب ہے؟ یہ دو سوال

ہیں جن کا جواب سویڈن کے ادیب گستاؤ بورگمان نے اپنی کتاب "شاہراہ سعادت" میں دینے کی کوشش کی ہے۔

ادیب موصوف کا خیال ہے کہ بخیل بلا مقصد مال جمع کرتا ہے۔ اس کو روپیہ سمیٹ سمیٹ کر رکھنے، اپنے اندوختہ کو بار بار دیکھنے اور اس کی کثرت و فراوانی کے یقین میں ایک خاص قسم کی لذت ملتی ہے۔ بخلاف اس کے حریص کے سامنے چند خاص مقاصد ہوتے ہیں جن کے لئے وہ روپیہ پس انداز کرتا ہے مثلاً یہ کہ روپے مستقبل کی ضروریات میں کام آئیں گے یا کسی بڑے کام کے انجام دینے میں مدد دیں گے، یا ان کے ذریعہ سے وہ خوشحالی و فارغ البالی کی ایسی زندگی بسر کر سکے گا جس میں ذلت و حقارت کا کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔

بخیل ایک خیالی انسان ہے وہ روپیہ کے اکٹھا کرنے اور اس کے بڑھانے ہی میں کامیابی کے زلف و گیسو آراستہ کرتا ہے۔ اس کے سوا اس کے سامنے اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ اور نہ اس کے پیش نظر کوئی ایسی غرض ہوتی جس کے حصول کیلئے یہ اندوختہ کام آئے۔

حریص عملی انسان ہے۔ زندگی میں روپیہ کی جو قدر و قیمت ہے وہ اسے سمجھتا ہے وہ ان گھاٹیوں سے بھی واقف ہے جن میں اس کے اندوختہ کے چور ڈاکو چھپے بیٹھے ہیں۔ وہ بخیل کی طرح نہیں ہے۔ جس کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے وجود سے بھی نفرت ہو جاتی ہے۔ اور بالآخر سب کی نگاہوں کے لئے ایک کھٹک بن کے رہ جاتا ہے۔ بلکہ وہ عقل و فہم رکھتا ہے۔ اپنے معاملات سمجھتا ہے اور موقع و محل کے لحاظ سے روپیہ کے ضروری مصرف سے بھی واقف ہے مگر ہے حریص!!

لیکن یہی حرص بخالت کی بھی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حریص کو روپیہ سے جو محبت ہوتی ہے اور روپیہ کو گن گن کر رکھنے اور اس کے جمع کرنے میں اسے جو لذت ملتی ہے آہستہ آہستہ یہ لذت خرچ کرنے کی لذت سے بڑھ جاتی ہے۔ پس اس کو گن گن کر پس انداز کرنے میں مزہ ملنے لگتا ہے اور وہ ہر حالت میں خرچ کرنے کے بجائے اپنے پاس محفوظ رکھنے کو ہی بہتر سمجھنے لگتا ہے۔

اس پستی سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے نفس کی ایسی تربیت کریں کہ اس کے اندر روپیہ جمع کرنے اور اس کو حقیر سمجھنے کے جذبات ہمیشہ ساتھ ساتھ پیدا ہوں، وہ روپیہ کا حریص بھی ہو اور مواقع ضرورت اور کار خیر میں اسے صرف کرنے کے لئے بھی آمادہ رہے۔ کیونکہ حصول مال کا اگر کوئی مقصد ہے تو وہ یہی ہے کہ اسے مواقع ضرورت اور کار خیر میں خرچ کیا جائے۔ باقی محض جمع کرنا اور اس کو دیکھ دیکھ کر خوش ہونا کوئی مقصد نہیں ہے۔

برائے نہادن چہ سنگ و چہ زر

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ حرص سے حکمت و نظام کے فضائل وجود میں آسکتے ہیں۔ لیکن بخالت سے سنگدلی، شقاوت، وحشت و بربریت حسی بلادت اور فکری و روحانی دنائیت کے سوا اور کوئی فضیلت وجود میں نہیں آسکتی ہے یہی وجہ ہے کہ حریص کے لئے لوگوں کے اندر کچھ نہ کچھ احترام کا جذبہ ہوتا ہے۔ لیکن بخیل کے لئے ہر شخص کے دل میں نفرت ہی کا جذبہ ہوتا ہے۔ لوگ اس کے ساتھ دلی بغض رکھتے ہیں اور ہمیشہ اس کی تباہی کے آرزومند رہتے ہیں۔

مایوسوں کا سہارا!

امریکن ادیب فوکز نے اپنی کتاب "مایوسوں کی غذا" میں جذبہ یاس کی نہایت خوبی کے ساتھ تحلیل کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ انسان کا اس زندگی میں مایوس ہونا اس کے لئے بڑی خرابی کا باعث ہے۔ اس لئے نہیں کہ یاس کے معنی محرومی و نامرادی کے ہیں، اور اس کی غایت، راحت، کسل، اور تسلیم و رضا ہے، بلکہ اس لئے کہ یاس کے اندر ایک خوفناک قوت کارفرما ہوتی ہے جو ہمارے جوش و نشاط کو سرگرمی و عمل کی دنیا سے نکالکر خواب و خیال کی دنیا میں پہنچادیتی ہے۔ جس وقت انسان کا کوئی اہم مقصد پورا نہیں ہوتا یا کسی بڑے کام کی تکمیل اس کے نزدیک ناممکن ہوتی ہے تو اس پر یاس کا جذبہ مستولی ہوجاتا ہے۔ پھر وہ اسی جذبہ سے غذا حاصل کرتا ہے۔ اور شیخ چلی کے سے منصوبوں کے تصور میں زندگی بسر کرنا شروع کردیتا ہے۔

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کےرات دن
بیٹھے ۔رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

یہی وجہ ہے کہ یاس سے وہم کو تقویت پہنچتی ہے۔ آدمی روزانہ کی پرمشقت زندگی کے بہ نسبت ایک تخیلی اور خیالی دنیا میں زندگی بسر کرنا زیادہ آسان اور لذیذ پاتا ہے۔ چونکہ خیالات اور آرزوؤں سے انسان کو قدرتی دلچسپی ہے اس لئے ہم ان حالتوں میں یاس ہی کو اپنے لئے بہتر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہی تمام خیالات کی کنجی ہے، اسی سے ہم کو غذا ملتی ہے اور اسی کے سہارے ہم جیتے ہیں۔

دنیا میں بہت سے ایسے مایوس ہیں جو کسی خیال کو عملی جامہ پہنانے کے بجائے اسی کو

اٹھتے بیٹھتے رہتے ہیں یہی دراصل فریب یاس ہے جو انسان کی روح اور اس کے ذاتی جوہر کیلئے اس آسمان کے نیچے سب سے زیادہ مہلک چیز ہے۔

یاس کے اندر جب کوئی دوسرا جذبہ "خاص کر انانیت" مل جاتا ہے تو اس میں مایوس کیلئے عجیب و غریب لذت پیدا ہوجاتی ہے۔ ایسا انسان زندگی اور اپنے ہم جنسوں کو حقیر خیال کرنے لگتا ہے۔ اپنے آپ کو لوگوں سے برتر سمجھتا ہے، اپنی پوزیشن لوگوں کے درمیان کسی فلسفی سے کم ...... نہیں سمجھتا۔ بلکہ اس کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اسکی بدبختی ہی کہ وہ ان اراذل کے اندر پھینک دیا گیا۔

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

یہ مختلف صورتیں ہیں جنمیں چھپکے یاس، قلب انسانی کے اندر گھستی ہے اور اسکو فریب میں ڈالکر اسکے سامنے بے بسی و بیچارگی کے ایسے ہولناک مناظر پیش کرتی ہے کہ انسان بجز ایک خیالی عالم کے اور کہیں سکون نہیں پاتا۔

جب تم کو یہ معلوم ہو کہ تم کسی بڑے کام کی انجام دہی سے قاصر ہو تو تم یہ یقین کرلو کہ یہ عجز محض وقتی ضعف ہے جو اس وقت طاری ہوگیا ہے۔ اسوقت کام کو چھوڑ کر کنارہ کش ہوجاؤ۔ اور مایوس مت ہو، پھر اسکی طرف پرسکون ساعتوں میں توجہ کرو۔ اسوقت تم دیکھوگے کہ جو کام کل تمہیں پہاڑ معلوم ہوتا تھا آج وہ تمہارے لئے اتنا مشکل نہیں رہ گیا ہے۔ اور جب ہمت کرکے اس پر ہاتھ لگادوگے اور کچھ دن اس پر جمے رہوگے تو نہ صرف یہ کہ اس کی تمام گرہیں کھل جائیں گی بلکہ تم اس کی مشکلوں میں ایک لذت محسوس کروگے۔

تقریظ و تبصرہ

قتیل اور غالب۔ مصنفہ جناب سید اسد علی انوری فرید آبادی۔ بی، ایس سی علیگ آئی ایف، اس۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۳۰ صفحے۔ کتابت و طباعت بہت خراب کاغذ سفید گلیز قیمت ۸؎

یہ کتاب قتیل و غالب کی لسانی معرکہ آرائیوں کا مجموعہ ہے۔ ان بزرگوں کی لسانی معرکہ آرائیاں ان کی کتابوں نیز ان کی سوانح عمریوں میں موجود ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مصنف کو کہیں کی اینٹ، کہیں کے روڑے سے بھان متی کا ایسا نادر کنبہ جوڑنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ انکی گندگیاں ان کے ساتھ گئیں۔ اب ان کے اچھالنے سے سوائے اس کے کہ ایک بیکار سا فتنہ بڑھے، کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا۔ ہم کو یہ کتاب بالکل ناپسند ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ قتیلی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے آپ نے غالب کی شہرت پر خاک ڈالنے کی بھی کوشش کر ڈالی۔ جا بجا آپنے غالب کے کلام پر اعتراضات کی بوچھار فرمائی ہے لیکن نکتہ چینی کے لئے بھی سلیقہ اور فہم کی ضرورت ہے۔ آپکے اندر بد قسمتی سے یہ دونوں چیزیں مفقود ہیں۔ مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر آپکے نزدیک مبتذل ہے:۔

بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہئے مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہئے

اس پر آپ کا اعتراض یہ ہے کہ "بھوں پا اور بھول پو میں تھوڑا ہی فرق ہے"۔ یا غالب کے اس شعر کے متعلق:۔

کچھ نہ کی اپنے جنون نارسا نے ورنہ یاں ذرہ ذرہ روکش خورشید عالم تاب تھا

آپ فرماتے ہیں "یہاں "کچھ نہ کیا"، "آ نہ سکا" "کچھ نہ کی" باندھ دیا۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ غالب کا کلام ابتدائی اور دوسرے عیوب سے بالکل پاک ہے بلاشبہ ان کے کلام میں عیوب ہیں آپ انھیں کھول کھول کر بیان فرمائیں یہ آپ کی ادبی خدمت متصور ہوگی اور آپ ہر طرح خراج تحسین کے مستحق ہوں گے۔ لیکن اگر آپ نکتہ چینی کے حدود سے گذر کر صرف منہ چڑائیں گے تو اس پر اہل مذاق سر پیٹنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔ پھر غالب اور قتیل جب حریف تھے تب تھے۔ اب تو زمانہ کے اجماع نے اس بحث کا خاتمہ کر دیا۔ ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ جامعہ، دہلی۔

ادب لطیف افسانہ نمبر۔ مرتبہ جناب چودھری برکت علی بی اے۔ و مرزا ادیب بی اے تقطیع ۲۰×۳۰/۸ حجم ۱۲۸ صفحے۔ کتابت و طباعت اور کاغذ عمدہ قیمت سالانہ ۳؎ افسانہ نمبر ۱۲؎ مقام اشاعت مکتبہ اردو۔ لاہور۔

ادبی رسائل کی اب یہ کچھ رسم سی ہوگئی ہے کہ وہ سال کے اندر، اپنے ناظرین کے سامنے، ادب کے مختلف عنوانات پر چند مخصوص نمبر پیش کرتے ہیں۔ اس رسم کے نباہنے کی دھن میں بہت سے رسائل اپنا سارا زور انہی مخصوص نمبروں پر صرف کر دیتے ہیں اور بقیہ پرچوں میں ان کی معمولی شان بھی باقی نہیں رہتی۔ لیکن ادب لطیف حتی الوسع اپنی روایت و شان کو قائم رکھتا ہے۔

اس سال اس کے کئی خصوصی نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ پیش نظر پرچہ افسانہ نمبر ہے۔ اور یہ اپنے سابق خصوصی نمبروں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ شروع میں فن افسانہ نگاری سے متعلق دو تین مقالے درج کئے گئے ہیں، جنہیں اس فن کے مبادی، اسکے قدیم و جدید رجحانات اور اس کے روشن و تاریک پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے اور افسانہ کے نئے و پرانے معیار کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ اس کے بعد سب افسانے ہیں جنہیں زیادہ تر رومانی بعض

معاشرتی اور ایک آدھ طنزیہ ہیں۔

پیام نسواں مدیرہ جناب شمیم آرا بیگم نجمہ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۸ حجم ۵۰ صفحے کتابت وطباعت صاف ستھری۔ کاغذ سفید گلیز۔ قیمت سالانہ ۲ فی پرچہ تین آنے۔ پتہ: دفتر اشاعت ماڈل ہاؤس لکھنؤ۔

یہ رسالہ جیسا کہ اس کے کارکنوں کا دعویٰ ہے، خواتین ہند کا ایک ترقی پسند ماہنامہ ہے۔ ابتدا میں "افکار وخیالات" کے تحت کچھ اپنی رام کہانی اور کچھ انعامی معموں کا پروپگنڈا ہے۔ اس کے بعد معموں کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ پھر کشتی حیات، محبت کی شام، انقلابی دلہن، دو شعلے، مالن، برباد تمنا، نقوش محبت، بی کا پیار، محبت کی آخری فتح وغیرہ سے عنوانات سے چند بے مغز اور سطحی قسم کے مضامین ہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ ترقی پسندی کا کیا مفہوم سمجھتے ہیں۔ اگر یہی ترقی پسندی ہے جس کے یہ چند نمونے آپ نے دیکھے ہیں، تو اس پیام نسواں سے ہمارے ملک کی عورتیں اسی غار میں گریں گی جس میں ان کی مغربی بہنیں گر چکی ہیں۔ پھر اسکو ترقی کیوں کہیے؟

آخر کے ۴۰-۵ صفحات میں خواتین کے فائدہ کے دو ایک مضمون اور کشیدہ کاری کے چند اچھے نمونے ہیں۔ یہ صفحات غنیمت ہیں۔ اگر یہ بھی نہ ہوتے تو پیام کے ساتھ نسواں کی اضافت کچھ بے معنی ہی سی تھی۔

تفسیر سورہ عصر

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورہ عصر کا اردو ترجمہ ہے۔ تفسیر خصوصیت کے ساتھ بعض دقیق مباحث قرآنی کی حامل ہے۔ لفظ عصر کی تحقیق اور زمانہ کے قسم کی تاویل نہایت بصیرت افروز ہے۔ آخر میں ایمان کے مفہوم اور حق وصبر کے باہمی تعلق کی تشریح بھی بڑی اثر انگیز اور ایمان افروز ہے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۲ صفحے۔ کاغذ عمدہ۔ کتابت وطباعت جاذب نظر۔ قیمت ۲ر

تفسیر سورہ لہب

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ کی تفسیر سورہ لہب کا اردو ترجمہ ہے۔ اسمیں عام خیال کی مدلل تردید کی گئی ہے کہ یہ سورہ بددعا ہے۔ ابولہب اور اس کی بیوی کے وجوہ ذکر نہایت اثر انگیز ہیں۔ اس تفسیر کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا۔ کتابت وطباعت بہترین۔ کاغذ نہایت عمدہ۔ حجم ۱۴ صفحے۔ قیمت ۲ر

تفسیر سورہ کافرون

اس میں ہجرت اور براءت کا اصلی فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ اور نبوت کے مراحل و تعامات کی توضیح اس قدر حکیمانہ انداز میں کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بیشمار مشکلات آپسے آپ حل ہو گئی ہیں۔ کتابت وطباعت بہترین۔ کاغذ عمدہ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۴۰ صفحے۔ قیمت ۴ر

مینیجر